رجسٹرڈ نمبر اے ۴۹۶

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰ر

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا
ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام
نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ
سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی
تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ
کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے
نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے
ضخامت ۲۰۲ صفحات، مجلد نو روپیہ لعہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے
ان کی مختصر فہرست یہ ہے:- اصحاب کہف معجزہ و کرامت
انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح خضر
کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور وہان ہی
حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا
توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت
حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ
ضخامت ۲۲۴ صفحات کاغذ سفید و بیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات
اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے
ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا
اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد
مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے
اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی
مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو
پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے
ضخامت بھی زیادہ ہے
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات
ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان
ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے
بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے
اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل
بھی ملے آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی
جگہ معیار ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس
اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے
ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے
قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ
جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا
بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور
ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر
واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے اوراق
میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں
حضرت نیاز کی انشاء نے اور
زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں نفسانی کی تمام فطری
اور غیر فطری قسموں کے حالات
تاریخی و نفسانی حیثیت سے نہایت شرح
و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے
کہ نفسانی دنیا میں کب اور کس طرح رائج
ہوئی۔ یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں
کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز
واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازی کمپنی)

خاص حج سروس

مغل لائن کے مقبول عام جہازات امسال بھی حسب معمول حاجیوں کی خدمت کے لئے وقف ہوں گے۔

کرایہ (معہ خوراک) **بمبئی سے جدّہ اور واپسی**

درجہ اول ۰۔ ۱۱۵۱ روپے

عرشہ (ڈیک) ۰۔ ۴۱۵ روپے

ان کرایوں میں جدہ کی صفائی کے محصولات اور ٹرانسپورٹ کے اخراجات جو مجموعی طور پر ۲-۸۴ روپے ہوتے ہیں، شامل نہیں ہیں۔

اہم اطلاع عازمین حج کے پاس انٹرنیشنل فارم پر ہیضہ اور چیچک کے لگوانے کا سرٹیفکٹ ہونا چاہئے۔ ہیضے کے سرٹیفکٹ میں یہ درج ہونا ضروری ہے کہ عازم حج نے سات روز کے وقفے سے دو انجکشن لئے ہیں اور یہ کہ دوسرا انجکشن جہاز کی روانگی کی تاریخ سے کم از کم سات روز قبل لیا گیا ہے۔ اسی طرح چیچک کے سرٹیفکٹ میں یہ اندراج ہونا چاہئے کہ جہاز کی روانگی کی تاریخ سے کم از کم چودہ دن قبل چیچک کا ٹیکہ لگوایا گیا ہے۔ سرٹیفکٹ مقررہ انٹرنیشنل فارموں پر مقامی میونسپلٹی کے محکمہ حفظان صحت کے حکام سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ ہیضہ کے سرٹیفکٹ ۶ ماہ تک اور چیچک کے سرٹیفکٹ ۳ سال تک کارآمد ہوں گے۔

عازمین حج کو چاہئے کہ ابھی سے ہیضے اور چیچک کے ٹیکے لگوا کر سرٹیفکٹ طیار رکھیں۔

نشستیں محفوظ کیجئے جہازوں کی نشستیں محفوظ کی جارہی ہیں۔ عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بلا تاخیر اپنے نام ہمارے ہاں درج کرالیں۔ درخواست میں مندرجۂ ذیل تفصیلات کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) ہر ایک عازم حج کا پورا نام۔ (۲) والد یا شوہر کا نام (۳) عمر (۴) پورا پتہ (۵) کس درجہ کا ٹکٹ درکار ہے؟ کن تاریخوں میں سفر کا ارادہ ہے؟ اگر ساتھ میں بچے ہوں تو ان کا نام وغیرہ درج کرانا بھی نہایت ضروری ہے، خواہ وہ شیر خوار ہی کیوں نہ ہوں۔ جہاز میں جگہ ملنے کی گارنٹی نہیں دیجا سکتی، لیکن یہ ضرور ہے کہ جن کے نام ہمارے ہاں درج ہوں گے ان کو ٹکٹ پہلے دئے جائیں گے۔

نشستیں محفوظ کرانے کا پتہ :-

ٹرنر مارسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

منیجنگ ایجنٹس :- دی مغل لائن لمیٹڈ

۱۶، بنک اسٹریٹ، فورٹ بمبئی

تار کا پتہ :-

MOGUL
BOMBAY

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے
"نگار" آٹھ روپیہ چھ آنے میں وی۔پی ہوگا

نگار

اس امر کی کہ آپ کا چندہ ستمبر میں ختم ہوگیا اور اکتوبر کا جس میں سالنامہ ۵۳ء کی قیمت بھی شامل ہے۔

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۲	فہرست مضامین ستمبر ۱۹۵۲ء	شمارہ ۳

حکومت پاکستان کی خدمت میں بہ صد معذرت ... اڈیٹر... ۳
نسخۂ حمیدیہ ..... حبیب احمد صدیقی ام۔اے ... ۶
مذاہب عالم کی تخلیق اور قطب شمالی .... محمد اسحاق صدیقی ۲۲
آوارہ گرد اشعار .... پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی ... ۳۱
ایک ہزار سال قبل کا ہندوستان ۳۴
گاہے گاہے باز خواں! (علم و یقین۔اعتقاد و مذہب) اڈیٹر۔ ۴۲
جدید فارسی لغت کی ضرورت ..... اڈیٹر ۴۷
وادیٔ نیل (نظم) ..... پروفیسر شور ۵۰
شہزادۂ ظلمت (نظم) ... فضا ابن فیضی اعظمی ۵۱
تصویر و تصور ... سیدہ اختر ـــ ندیم جعفری ... ۵۳
مطبوعات موصولہ ۵۴

آئندہ سالنامہ داغ نمبر کی اہمیت کا اندازہ

اس کے بعض عنوانات اور اس میں حصہ لینے والے اکابر ادب کے ناموں سے کیجئے

چند عنوانات یہ ہیں:-

داغ کے حالات زندگی ـ داغ کا اثر اردو شاعری پر ـ داغ کا تغزل ـ داغ کی معاملہ بندی ـ داغ کی زبان ـ داغ کے محاورات ـ داغ کا فن ـ داغ کے تعلقات معاصرین سے ـ مکتوبات داغ ـ داغ کی شاعری کا جمالیاتی عنصر ـ داغ کی معاملہ بندی و محاکات ـ داغ کے غیر مطبوعہ خطوط ـ تلامذۂ داغ ـ داغ کی شاعری کے صحت مند عناصر ـ تلامذۂ داغ ـ داغ تذکروں میں ـ داغ کے خطوط منشی نبی حجاب کے نام ـ داغ کے یہاں لب و لہجہ کی اہمیت ـ داغ خطوط کی روشنی میں ـ داغ و امیر کے تعلقات ـ داغ اور رامپور ـ داغ اور حیدر آباد ـ انتخاب کلام داغ وغیرہ ـ

وہ اکابر ادب جو اس میں حصہ لے رہے ہیں:- پروفیسر مجنوں گورکھپوری ـ پروفیسر فراق گورکھپوری ـ پروفیسر سرور ـ پروفیسر احتشام حسین ـ پروفیسر ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی ـ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ـ پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی ـ پروفیسر وقار عظیم ـ پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ـ پروفیسر ڈاکٹر محی الدین قادری زور ـ پروفیسر سید صفدر حسین ـ پروفیسر عطاء الرحمان ـ پروفیسر اختر اورینوی ـ پنڈت دتاتریہ کیفی ـ خلیل الرحمان اعظمی ـ مختار الدین احمد آرزو ـ پروفیسر اسلوب احمد انصاری ـ پروفیسر عبدالقادر سروری ـ مولانا عرشی (رامپور) ـ محمد علی خاں اثر رامپوری ـ سراج الدین علی خاں بی۔اے ـ وقار خلیل شاہ پوری ـ سید تمکین کاظمی ـ کلب علی خاں فائق رامپوری علامہ جمیل مظہری ـ حبیب احمد صدیقی ایم۔اے ـ اڈیٹر نگار ـــ یہ سالنامہ نگار کے سالانہ چندہ آٹھ روپیہ سالانہ میں شامل ہے۔ منیجر نگار

(نوٹ:- پریس کی مشین خراب ہوجانے کی وجہ سے ایک ہفتہ دیر میں شائع ہوا)

حکومتِ پاکستان کی خدمت میں بہ صد معذرت

(ایک مفروضہ جو خدا کرے جھوٹ ہو)

ایک سیّاح کی ڈائری کے چند اوراق

(جو آئندہ کسی وقت بھی شایع ہو سکتے ہیں)

سنہ ۱۹۵۲ء اور اس کے بعد

ایشیا کی سیاحت کا شوق مجھے ہمیشہ دامنگیر رہا ہے، اس لئے جب میں نے اول اول سرزمین سندھ میں قدم رکھا تو اپنے اندر ایک خاص جذبۂ مسرت محسوس کیا

اس وقت سندھ کا علاقہ ایک نوزائیدہ سلطنت - "پاکستان" — میں شامل ہے اور اسی سرزمین کی ایک مشہور بندرگاہ "کراچی" میں سب سے پہلے میں نے قدم رکھا — یہ بڑا خوبصورت شہر ہے اور حکومت پاکستان کی سب سے بڑی تجارتی منڈی — قیام پاکستان سے قبل یہاں کی آبادی تین لاکھ سے زیادہ نہ تھی لیکن اب وہ تیرہ لاکھ تک پہونچ گئی ہے، جس میں تقریباً نصف حصہ ان مہاجرین کا ہے جو ہندوستان چھوڑ کر یہاں آباد ہو گئے ہیں

پاکستان کا قیام در اصل ایک مذہبی رومان ہے، جس نے بعد کو سیاسی انقلاب کی شکل اختیار کر لی اور کافی خونریزی کے باوجود پاکستان کو کامل پانچ سال تک یہ سمجھنے کا موقع نہ دیا کہ وہ اس سودے کو گراں سمجھے یا ارزاں !

جس وقت میں نے سرزمین پاکستان میں قدم رکھا وہ دُنیا کی سب سے بڑی مُسلم حکومت تھی، لیکن آپ یہ سُن کر حیرت کریں گے کہ میرے دورانِ قیام میں دو سال کے اندر ہی وہ "**غیر مُسلم جمہوریت**" میں تبدیل ہو گئی !

یہ داستان بہت پُرلطف ہے، اس لئے میں اسے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں

چونکہ پاکستان اور مسلم حکومت دونوں کا تصور ایک ہی ساتھ پیدا ہوا تھا، اس لئے انقلاب کی ابتدائی منزل گزرنے کے بعد جب یہاں تشکیلِ "دستور" کا سوال سامنے آیا تو مذہبی علماء نے (جن میں ہندوستان کے چند وہ علماء بھی شامل تھے جو پاکستان کو بہترین "چراگاہ" سمجھ کر یہاں بھاگ آئے تھے) سوچا کہ حکومت پر چھا جانے، دُنیا میں

عزو جاہ حاصل کرنے اور پاکستان کی دولت پر قابض ہوجانے کا وقت اگر کوئی ہوسکتا ہے تو یہی ہے اور اس لئے انھوں نے کانسٹی ٹیوشن بننے سے قبل ہی یہ سوال اُٹھایا کہ "دستور کی تشکیل سے قبل یہ فیصلہ ہوجانا ضروری ہے کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے اور کس آبادی کو صحیح معنے میں مُسلم آبادی کہا جاسکتا ہے"

ظاہر ہے کہ حکومت کے لئے یہ فیصلہ دشوار تھا اور اس کے تصور میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کسی وقت یہ سوال پاکستان میں اُٹھ سکتا ہے، وہ اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ ہر وہ شخص جو اپنے آپ مسلمان کہتا اور مسلم کمیونٹی کا فرد قرار دیتا ہے، مسلم ہے اور اگر بعض جماعتوں کے اندر بعض فروعی مسایل میں اختلاف پایا بھی جاتا ہے تو وہ ایسا نہیں جس کے پیش نظر کسی جماعت کو اسلام سے خارج کردیا جائے۔ علاوہ اس کے چونکہ یہ سوال خالص مذہبی حیثیت رکھتا تھا اس لئے یوں بھی پاکستان کے اربابِ حکومت کو کوئی حق نہ پہونچتا تھا کہ وہ اس باب میں کوئی فتویٰ صادر کرسکیں، لیکن چونکہ غلطی سے پاکستان کی سیاسی بنیاد ہی مذہب پر قایم ہوئی تھی اور مذہب سے ہٹ کر وہ کوئی قوت ایسی نہ رکھتی تھی کہ اس خطرناک ذہنیت کو دباسکتی، اس لئے مولویوں کا یہ رجحان جو یکسر ذاتی اغراض پر مبنی تھا رفتہ رفتہ قوی ہوتا گیا اور اس سلسلہ میں سب سے پہلا عملی قدم یہ اُٹھایا گیا کہ احمدی جماعت کو جو رسول اللہ پر سلسلۂ نبوت ختم ہونے کی قایل نہیں ہے، اسلام سے خارج کردیا گیا اور اسے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ حکومت سے کیا گیا

قیام پاکستان کے بعد یہ سب سے بڑا اور پہلا اندرونی خطرہ تھا جس سے حکومت کو دوچار ہونا پڑا اور وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے اس کا سدِ باب نہ کرسکی۔ اس پہلی کامیابی کے بعد علماء پاکستان کے حوصلے اور زیادہ بلند ہوئے اور انھوں نے سوچا کہ محض احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے سے تو مقصد پورا نہیں ہوتا کیونکہ اس جماعت کے دو ہی چار افراد ایسے ہیں جو کلیدی مناصب پر فایز ہیں اور اگر ان کو ہٹاکر ان مناصب کو حاصل کرلیا جائے تو بھی اصل مقصود پورا نہیں ہوتا، اس لئے اب انکی نگاہ شیعی جماعت کی طرف گئی جو احمدیوں سے زیادہ صاحبِ اقتدار تھی اور اس کے بہت سے افراد ممتاز عہدوں پر مامور تھے، چنانچہ انھوں نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے بعد ایک دوسرا کنونشن طلب کیا اور اس میں یہ سوال اُٹھایا کہ "کیا وہ جماعت جو خلفاء ثلثہ کو غاصب و منافق قرار دیتی ہے اور ان پر سب و شتم جزو ایمان سمجھتی ہے، مسلم کہلائی جاسکتی ہے، اور کیا اس کا یہ عقیدہ کہ خلیفۂ اول رسول اللہ کے صحیح جانشین نہ تھے نص قطعی کا انکار نہیں جس میں صاف طور پر خلیفۂ اول کو رسول اللہ کا "یار غار" ظاہر کیا گیا ہے اور کیا نص قطعی کا منکر کسی حیثیت سے مُسلم قرار دیا جاسکتا ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس منطق کا جواب کبھی حکومت کے پاس کوئی نہ ہوسکتا تھا، اس لئے انھوں نے شیعی جماعت کو بھی غیر مسلم اقلیت قرار دیدیا

اس کے بعد انھوں نے تقلید و عدم کا سوال اُٹھاکر تیسرا کنونشن اور طلب کیا اور ان لوگوں کو بھی اسلام سے خارج کردیا جنھیں وہ وہابی کہتے تھے ـــــ اس کے بعد مولویوں نے جو اپنے اپنے اغراض کے تحت مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اپنا اپنا "ادارۂ کافر گری" علٰحدہ قایم کرلیا ـــ ایک گروہ نے تمام ان مسلمانوں کو جو اس کے امیر کو اپنا امیر تسلیم نہ کریں، دوسرے گروہ نے اُن تمام مسلموں کو جو ان کی جمعیتہ کے صدر کو اپنا مذہبی پیشوا نہ قرار دیں غیر مسلم قرار دیدیا۔ ظاہر ہے کہ اس موقع سے واعظ پیشہ میلاد خوان قسم کے مولوی کیوں نہ فایدہ اُٹھاتے، چنانچہ انھوں نے بھی اعلان کردیا کہ:۔

۱۔ تمام وہ خوش حال افراد جو حج کی استطاعت رکھنے کے باوجود حج بدل کی خدمت مولویوں کے سپرد نہیں کرتے

۲۔ قوم کے وہ جملہ افراد جو صاحب نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ کی رقم مولویوں کے قایم کئے ہوئے یتیم خانوں میں داخل نہیں کرتے (جن میں سب سے زیادہ قابل رحم یتیم خود مولوی ہی ہوا کرتے ہیں)

۳۔ وہ تمام مسلمان جو ترک صوم و صلوٰۃ اور دیگر معاصی صغیرہ و کبیرہ کا کفارہ ادا کرنے کے لئے مولویوں کی خدمت میں قیمتی تحایف پیش نہیں کرتے

۴۔ وہ جملہ افراد جو نکاح و خلع، بیع و شریٰ کے مسایل میں حسب مراد فتویٰ حاصل کرنے کے لئے معقول نذرانہ نہیں دیتے

۵۔ وہ تمام مسلمان جو محافل میلاد و ذکر رسول کی تقریبات میں ذاکروں کی پوری فیس ادا کرنے سے گریز کرتے ہیں،

سب کے سب غیر مسلم ہیں ——— اور ——— آخر کار یہ "کاروبار کافر گری" اتنا بڑھا کہ جب تشکیل دستور کے وقت اکثریت و اقلیت کا سوال حکومت کے سامنے آیا تو وہ اعداد و شمار کو دیکھ کر حیران رہ گئی کیونکہ پاکستان کی ۸ کرور آبادی میں سے تقریباً ساڑھے سات کرور انسان غیر مسلم قرار دئے جا چکے تھے اور خالص مسلمانوں کی تعداد ۵۰ لاکھ سے زیادہ نہ رہگئی تھی

ہوسکتا ہے کہ حکومت پھر بھی خاموش رہتی اور کابینہ کے مباحث میں اس مسئلہ کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا — لیکن نامسلموں کی اتنی بڑی اکثریت کیونکر خاموش رہ سکتی تھی۔ اس نے بھی اپنا ایک کنونشن طلب کیا اور اس میں حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ:-

"چونکہ پاکستان میں اب مسلمانوں کی اکثریت، اقلیت میں تبدیل ہوگئی ہے، اس لئے پاکستان کو اپنے "**غیر مسلم جمہوری حکومت**" ہونے کا اعلان کر دینا چاہئے۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر وہ اپنی "مسلم جمہوریت" کی حیثیت قایم رکھنا چاہتی ہے تو پھر اسے ہمارے اس فیصلہ سے اتفاق کرنا چاہئے کہ جس طرح مولویوں نے ہمیں اسلام سے خارج کیا تھا اسی طرح آج ہم **مولویوں کو اسلام سے خارج کرکے ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دیتے ہیں**"

اسی کے ساتھ حکومت سے اس کنونشن نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ "مولوی جماعت کے ان تمام افراد کو جنھیں ہم نے غیر مسلم قرار دیدیا ہے، سندھ یا بلوچستان کے کسی ریگستانی علاقہ میں منتقل کر دیا جائے تاکہ وہاں رہکر وہ خود اپنی محنت سے روزی کمانا سیکھیں اور اپنی کالونی سے باہر جانا ان کے لئے قطعاً ممنوع قرار دیا جائے تاکہ" یہ خود نہ کچھ کرکے دوسروں کی محنت و دولت سے ناجایز فایدہ اُٹھانے والی نسل انسانی زیادہ پھیلنے نہ پائے اور پاکستان آیندہ ان کے خطرہ سے محفوظ رہے"

اس کنونشن کے بعد میں تو چلا آیا اور خبر نہیں کہ حکومت پاکستان نے اس مطالبہ کا کیا جواب دیا لیکن یہ ضرور سننے میں آیا کہ کچھ دن بعد کوئٹہ میں سخت زلزلہ آیا اور وہاں کی ایک بہت بڑی کالونی زمین کے اندر دھنس گئی۔

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے جس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے مانا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

یہ دوا دُنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے

معجون عنبری ولایت تک اسکے ملاح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے۔ جوان بوڑھے سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور گفتہ جات بیکار ہیں اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر تقویٰ دماغ ہے کہ رگیں کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اسکو شوق آمیز نظر سے تصور فرمائیے۔ اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا دزن کر لیجئے ایک ہفتہ آٹھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی۔ اس کے استعمال کرنے سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے طبیعت تھکن نہ ہوگی اور یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا نئی نہیں ہے بلکہ ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد بن کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آسکتی تجربہ کرکے دیکھ لیجئے اس سے مقوی دُنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی ۲ روپیہ خوراک چار روپیہ (للہ)

نوٹ:- فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دوا خانہ منگائیے

میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے نقالوں سے ہوشیار رہئے۔ میری ۲۲ سالہ شہرت پر بھروسہ فرمائیے۔

پتہ:- **حکیم ثابت علی پنج زبان خوش کلام**

(عالم شنوی مولانائے روم صاحب)

محمود نگر سٹیٹ لکھنؤ۔ یو۔ پی

نسخۂ حمیدیہ

مفتی محمد انوار الحق صاحب مؤلف نسخۂ حمیدیہ کے بیان کے مطابق اُن کے چند احباب نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کے مخالف تھے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ اس سے شاعر اپنے درجے سے گر جائے گا اور اس کی شاعرانہ عظمت کم ہو جائے گی۔ کسی انسان کی عظمت اس میں نہیں کہ وہ فرشتہ کی طرح معصوم اور بے عیب نظر آئے۔ اکثر ہوتا ہے کہ ہیرو پرستی میں ہیرو کی ایسی تصویر کھینچی جاتی ہے جو درخشاں رنگوں سے مزین نظر آئے اور جس میں ایک دھبہ بھی دکھائی نہ دے۔ یہ تصویر کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اصلیت سے دور ہونے کے سبب نہایت غیر دلچسپ ہوتی ہے، ممکن ہے نسخۂ حمیدیہ شایع ہونے سے غالب کی تصویر کے نقوش میں خفیف سا تغیر ہوا ہو مگر یہ تغیر ایسا نہیں جو تصویر کو بدنما کر دے۔ جس طرح غالب کے نجی خطوط نے اُن کی صحیح شخصیت کو منظر عام پر لا کر اُن کی ذات سے دلچسپی میں اضافہ کیا، اسی طرح نسخۂ حمیدیہ نے اُن کی شاعری کا مطالعہ زیادہ دلچسپ بنا دیا۔

غالب کی زندگی کے جتنے پہلو سامنے آتے جاتے ہیں اتنی ہی ان کی شخصیت زیادہ دلکش ہوتی جاتی ہے اس کا راز خود ان کی بے ریا زندگی ہے۔ وہ اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنے کو ہنر نہیں سمجھتے۔ اُن کو اپنے دلی جذبات کے اظہار میں خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔ نواب شمس الدین سے پنشن کے مقدمہ کی وجہ سے اُن کی مخالفت تھی۔ اُن کے پھانسی پانے پر غالب کے انتقامی جذبے کو جو تسکین ملی اُسے بے دریغ بیان کر دیا۔ وہ شراب خواری کو بُرا جانتے تھے۔ مگر اس کے جواز میں بہانے نہیں تراشتے تھے۔ وہ دین دار مسلمانوں کی طرح بہشت کے طالب اس لئے نہ تھے کہ وہاں دیدار الٰہی کی سب سے بڑی نعمت نصیب ہوگی۔ بلکہ انھیں بہشت کی تمنا اس لئے تھی کہ وہاں عمدہ اور خوش ذایقہ شراب ملے گی۔

وہ چیز جس کے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

اُن کے خطوط اُن کی بے ریا زندگی کے آئینہ دار ہیں جہاں دہلی کی بربادی اور دوستوں کی مفارقت پر غالب کا دل خون کے آنسو روتا ہے، وہیں اپنی بیہودی، خلفت اور پنشن کے لئے وہ دہلی کو تباہ کرنے والوں کے آگے ناصور سا بھی نظر آتے ہیں جہاں احباب سے حد درجہ اخلاص و محبت ہے وہیں قتیل، واقف، ملا غیاث الدین، محمد حسین دکنی اور اُن کے حامیوں کیلئے اُن کے دل میں آتشِ نفرت بھی فروزاں ہے۔ ایک طرف اگر علمی بحثیں اور دقیقہ سنجیاں ہیں تو دوسری طرف "ولد الزنا" "ولد الحرام" "قرم ساق" "احتلام الدود" ایسے رکیک الفاظ بھی بے تکلف استعمال کئے گئے ہیں۔ وہ اپنے مکاتیب میں اپنی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اگر وہ فرشتہ صفت ہوتے تو اُن کی شخصیت اتنی دلچسپ نہ ہوتی۔ اگر ان میں انسانی کمزوریاں نہ ملتیں تو ہمیں بجائے دلچسپی کے مغائرت کا احساس ہوتا۔ وہ بے دریغ "ایک ستم پیشہ ڈومنی سے" محبت کا ذکر کرتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ جس اصول پر ایسی محبت کرنا چاہئے وہ بھی بتا دیتے ہیں یعنی یہ کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ اسی طرح علمی بحث میں جو قاطع برہان کے سلسلہ میں چھڑی جب انھیں یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں مخالفین انھیں بے استادا نہ کہیں تو فوراً ایک خیالی استاد ملا عبدالصمد کو وجود میں لے آتے ہیں اور اس کا ذکر اس شد و مد سے کرتے ہیں جیسے در اصل اس کی صحبت سے مستفید ہوئے تھے۔ مگر پھر خود ہی اقرار کرتے ہیں کہ ملا عبدالصمد کا وجود ایجاد بندہ تھا ان تمام کمزوریوں کے باوجود غالب کی جو تصویر ایسے شخص کو

پیش کرتی ہے جس میں برائیوں پر اچھائیاں غالب ہیں جس میں خوشامد اور تملق کم اور خودداری اور رکھ رکھاؤ زیادہ ہے۔ جو جذبۂ نفرت سے مبرا نہیں۔ مگر خلوص اس کا اصلی جوہر ہے۔ جو باوجود سخت حاجت مند ہونے کے اگر دست سوال دراز کرتا ہے تو صرف اُن کے آگے جن کو دینا بار نہ ہو، جو اپنے اور دوسروں کے مراتب سے واقف ہے، اور دوستوں کی نیکوئی کو سب سے بڑی سعادت جانتا ہے۔ غرضیکہ غالب کی شخصیت نقاب اُٹھنے کے بعد زیادہ جاذبِ نظر زیادہ دلآویز اور زیادہ دلچسپ ہوجاتی ہے۔

مکاتیب کی طرح نسخۂ حمیدیہ نے بھی چند پردے اُٹھاکر اس دلچسپی میں گرانقدر اضافہ کیا۔ رہی شاعرانہ عظمت تو جہاں اس نسخہ میں صدہا اُلجھے ہوئے "فارسی زدہ" اشعار ملتے ہیں وہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ غالب کی بہت سی مشہور غزلیں اُنکے اسی "دورِ جہالت" کی کہی ہوئی ہیں جو ۱۲۳۷ھ یعنی اُن کی عمر کے پچیسویں برس پر ختم ہوا۔ غالب کا بیان تھا کہ "پندرہ سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھتا گیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اور اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ اشعار واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دئے اس بیان سے گمان ہوتا ہے کہ سوائے دس پندرہ شعر کے پچیس برس تک کے کلام میں اور کچھ محفوظ رکھنے کے قابل نہ تھا۔ اگر نسخۂ حمیدیہ شایع نہ ہوتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اس عمر تک غالب کی شاعرانہ صلاحیتیں ایسی نہ تھیں کہ اُن کو صفِ اول کے شعرا کے زمرہ میں شامل کرسکتیں۔ خوش قسمتی سے وہی مجموعۂ کلام جس کے اوراق غالب کے نزدیک یک قلم چاک کرنے کے قابل تھے نسخۂ حمیدیہ کے نام سے ہم تک پہونچا اور اس کے مطالعہ سے غالب کی شاعرانہ عظمت میں کئی حیثیتوں سے اضافہ ہوا۔ اول تو ہم کو معلوم ہوا کہ ۱۲۳۷ھ تک غالب نے جو کچھ کہا تھا وہ یک قلم چاک کردینے کے قابل نہ تھا بلکہ اس میں بہت سے اشعار ایسے تھے جو ان کے بہترین اشعار میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں غالب کی شاعری کی ارتقائی منزلوں سے واقفیت حاصل ہوئی اور پتہ چلا کہ ایک بڑا شاعر اپنی خامیوں پر آگاہ ہوکر کس طرح خود اپنی اصلاح کرسکتا ہے۔ سب سے بڑا فایدہ جو نسخۂ حمیدیہ کے شایع ہونے سے ہوا وہ یہ ہے کہ ایک کافی تعداد عمدہ اور پاکیزہ اشعار کی جو انتخاب کے وقت نظر انداز کردئے گئے تھے، ہم کو دستیاب ہوئی۔ کیا ستم ہے کہ مندرجہ ذیل شعر قابلِ انتخاب نہ ٹھہریں۔

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا

بصورت تکلف بمعنی تاسف
اسد میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا
سامانِ دعا وحشت تاثیر دعا ہیچ

دوستو مجھ ستم رسیدہ سے
دشمنی ہے وصال کا مذکور

اے چرخ خاک بر سرِ تعمیر کائنات
لیکن بنائے عہدِ وفا استوار تر

اے اسد ہم خود اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیاد ناداں ہے گرفتارِ ہوس

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم

اسد شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجوم تمنا سے لاچار ہیں ہم

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں،

ہے طلسمِ دہر میں صد حشر باداشِ عمل
آگہی غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں

بے چشمِ دل: کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق ورقِ انتخاب ہے

یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو
وہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا،
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

تا چند ناز مسجد و بت خانہ کھینچئے — جوں شمع دل بخلوتِ جانانہ کھینچئے
نہ حیرت چشم ساقی کی نہ صحبت دورِ ساغر کی — مری محفل میں غالب گردشِ ایام باقی ہے

(یہ پندرہ سولہ شعر یہاں بطور نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں آخر میں دو سوا دو سو اشعار جو میں نے انتخاب کئے ہیں۔ درج کرونگا)

نسخۂ حمیدیہ میں کچھ اشعار اور غزلیں جو حاشئے پر درج ہیں یقیناً ۱۲۳۷ھ کے بعد کی ہیں مثلاً وہ غزل جس کا مقطع ہے:-

منضمحل ہو گئے قوائے غالب — اب عناصر میں اعتدال کہاں

ایسے اشعار اور غزلوں سے قطع نظر صرف اس کلام کو جو ۱۲۳۷ھ میں رئیس بھوپال کے صاحبزادہ میاں فوجدار خاں کے لئے مرتب کیا گیا تھا، اور جو غالب کی پچیس برس کی عمر تک کا ہے، دیکھا جائے تو تیس چالیس ایسی غزلیں ملتی ہیں جو غالب کی مشہور غزلوں میں سے ہیں۔ ایسی کچھ غزلوں کے مطلع یہ ہیں:-

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا
شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا
تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا — اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا
حسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز
آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں — ہوئے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن — ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن
جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں — ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں — ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے — طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائیے
غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی — فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی — سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی
درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے — کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
آکہ میری جاں کو قرار نہیں ہے — طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی — امتحاں اور جو باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے — ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ان غزلوں میں سے کچھ تو کافی ترمیم و تنسیخ کے بعد مروجہ دیوان میں آئی ہیں۔ مگر کافی ایسی بھی ہیں جن میں صرف ایک آدھ

شعر گھٹایا بڑھایا گیا ہے اور بعض تو دونوں دیوانوں میں یکساں ہیں۔ جیسے :۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا — اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا
ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن — ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن
غم دنیا سے پائی بھی جو فرصت سر اٹھانیکی — فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
آکہ میری جان کو قرار نہیں ہے — طاقت بیدار انتظار نہیں ہے
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی — امتحاں اور جو باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

غالب کی بہت مشہور غزل "آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک" سے بھی "دور جہالت" کی کہی ہوئی ہے۔ صرف ایک شعر نکال دیا گیا ہے۔ مگر کسی شعر کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ ایک اور مشہور غزل "آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ کہیں جسے" میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ اس میں سے ایک ایسا شعر بھی نظر انداز کر دیا گیا جس پر حیرت ہوتی ہے۔

یارب مجھے تو خواب میں بھی مت دکھائیو — وہ محشرِ خیال کہ دنیا کہے جسے

"جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی" بھی غالب کی مشہور غزلوں میں سے ہے۔ اس نے سے صرف ایک شعر کم کر کے پوری غزل مروجہ دیوان میں شامل کی گئی ہے۔ بعض بعض اشعار تو ایسی پختگی اور بالغ نظری کے حامل ہیں کہ اگر نسخۂ حمیدیہ کی شہادت نہ ہوتی تو کسی طرح یقین نہ آتا کہ بالکل ابتدائی دور میں کہے گئے ہوں گے۔ مندرجۂ ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ یہ شعر کس بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہیں :۔

تھا خواب میں خیالی کو تجھ سے معاملہ، — جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری — حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا،
لوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
حریف جوششِ دریا نہیں خودداری ساحل — جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے — شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر — میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر
نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز
آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

(پوری غزل)

گر تجھکو ہو یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

زانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانہ خراب نہ احساں اُٹھائیے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بانداز چکیدن صرنگوں وہ بھی

لئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ دائر گوں وہ بھی

میں نامرادوں کی تسلی کو کب اکردوں،
ہانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی،

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

سر پہ ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر،
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے،
آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے،

کس کا سراغ جادہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے،

نسخۂ حمیدیہ شایع نہ ہوتا تو ان اشعار یا مندرجہ بالا غزلوں پر گمان بھی نہ گزرتا کہ غالب کے ابتدائی دور کی ہیں، ان کو غالب کے اور کلام میں ملا جلا کر پڑھئے تو بالکل احساس نہ ہوگا کہ ہم دو مختلف ادوار کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ جب نسخۂ حمیدیہ کے ذریعہ ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور ایسے اور بہت سے اشعار غالب پچیس برس کی عمر تک کہہ چکے تھے تو یقیناً غالب کی شاعرانہ عظمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ غالب کے بیان سے جو دھوکا ہوتا تھا کہ پچیس برس تک انھوں نے جو کچھ کہا تھا قابلِ اعتنا نہ تھا، وہ نسخۂ حمیدیہ کے توسط سے دور ہوگیا۔ اور یہ ثابت ہوا کہ غالب میں ابتدا ہی سے شاعری کا وہ جوہر موجود تھا، جس نے انھیں بقائے دوام عطا کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرفی اور کیٹس کی طرح اُن کا شاعرانہ شعور بھی بہت جلد بالغ ہوگیا تھا اور اگر عرفی اور کیٹس کی طرح غالب کی موت بھی عنفوانِ شباب میں واقع ہوتی (جو اُردو ادب کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہوتا) تو بھی وہ ایک ایسا ادبی کارنامہ چھوڑ جاتے جو ہمیشہ رہنے والا ہوتا۔ انھوں نے مولوی عبدالرزاق شاکر کو زندگی کے آخر دور میں لکھا تھا:۔ "نظم و نثر کی طرز کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا ہے۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قایم رہے گا۔" مجھے یقین ہے کہ اگر نظم میں غالب سوائے اس مجموعے کے جو ۱۲۳۷ھ میں مرتب ہوا تھا اور کچھ نہ چھوڑ جاتے تو بھی قیامت تک اُن کا نام و نشان باقی و قایم رہتا۔

یہ ضرور ہے کہ نسخۂ حمیدیہ غالب کی ابتدائی کجروی کی سیکڑوں مثالیں پیش کرتا ہے۔ بیشتر اشعار ایسے ہیں جو "فارسی زدگی" کے باعث اُردو کے دائرہ سے خارج ہیں اور جن میں سے کچھ بعد میں غالب نے اپنے فارسی دیوان میں شامل کرلئے۔ اُنکی طبیعت کو رائج تقلید سے منحرف تھی اور وہ ہر بات کو بالکل نئے انداز سے کہنا چاہتے تھے۔ اس افتادِ طبع نے اُن کے ابتدائی کلام میں جو پیچیدگی پیدا کردی۔ بیدلؔ کا پیچیدہ طرزِ بیان ان کو اس قدر پسند آیا کہ اُسے شاعری کا خدا سمجھنے لگے۔ غالب کو بیدلؔ سے کس قدر عقیدت تھی اس کا اظہار مروجہ دیوان میں بھی پایا جاتا ہے مگر نسخۂ حمیدیہ میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے اُن کی والہانہ گرویدگی بہت نمایاں ہو جاتی ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

گر ملے حضرت بیدلؔ کا خطِ لوحِ مزار اسدؔ آئینۂ پرواز معانی مانگے

غالبؔ کی جدت طرازی اور مشکل پسندی نے جہاں اُن کے کلام کو تازگی اور شگفتگی بخشی وہاں اُن سے ایسے اشعار بھی کہلوائے جو معمہ بن کر رہ گئے اور ان میں سے بعض نے تو حد درجہ مضحکہ خیز شکل اختیار کی مثلاً :-

صبح قیامت ایک دُم گرگ تھی اسدؔ، جس دشت میں وہ شوخ دو عالم شکار تھا
شیشۂ آتشیں رُخِ پر نور، عرق از خط چکیدہ روغنِ مور

تیرے کوچے میں ہے مشاطۂ دامانگی قاصد پرِ پرواز زلفِ باز سے ہدہد کے شانے میں
یاں فلاخن باز کس کا نالۂ بے باک ہے جادہ تا کہسار موئے چینیِ افلاک ہے
فنا گرتی ہے زائل سرنوشتِ کلفتِ ہستی سحر از بہرِ شستِ دشوئے داغِ ماہ صابوں ہو
غرورِ دستِ رونے شانہ توڑا فرقِ ہدہد پر سلیمانی ہے ننگ بیدماغانِ خود آرائی
زخم دل پر باندھے حلوائے مغزِ استخواں تندرستی فایدہ اور ناتوانی مفت ہے
ان ستم کیشوں کے کھائے ہیں زبس تیر نگاہ پردۂ بادام یک غربالِ حسرت بیز ہے
بیابانِ فنا ہے بادِ صحرائے طلب غالبؔ پسینہ توسنِ ہمت کا سیل خانہ زیں ہے

ایسے اشعار کے ساتھ ساتھ جب ہم نہایت سلیس اور پاکیزہ اشعار (جن کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں) پاتے ہیں تو سخت تعجب ہوتا ہے کہ بیک وقت یہ کیسے ممکن ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ غالبؔ کی طبیعت میں ابتدا ہی سے صحیح شاعرانہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ جدت طرازی اور بیدلؔ کی پیروی میں وہ کچھ عرصہ دشوار گزار گھاٹیوں میں بھٹکتے رہے۔ مگر ان کے ذوقِ سلیم نے زیادہ بھٹکنے نہ دیا اور بالآخر وہ جلد ہی اپنے صحیح مقام پر پہونچ گئے۔

ابتدائی دور کے پیچیدہ کلام میں جو اصلاحیں غالبؔ نے بعد میں کی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں، کہیں کہیں تو صرف ایک آدھ لفظ کے ردوبدل سے شعر کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے اُن کی نکتہ رس طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔

"جراحت تحفہ الماس ارمغان نادیدنی دعوت" میں نادیدنی دعوت کے بجائے "خونِ جگر ہدیہ" رکھ دیا۔

"شور پند ناصح نے زخم پر نمک باندھا" میں نمک باندھا کا محل نہ تھا "نمک چھڑکا" کر دیا۔

"مرگیا صدمۂ آواز سے تم کی غالبؔ"۔ میں "صدمہ آواز سے تم کی" نامناسب ترکیب تھی اصلاح پاکر یہ مصرعہ یوں ہوا "مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ"۔

"نہیں بندِ زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر"۔ یہ مصرعہ دوسرے مصرعہ سے زیادہ ربط نہ رکھتا تھا پورا مصرعہ بدل کر شعر یوں بنا دیا۔

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

"حسد پیمانہ سے دل عالم آب تماشا ہو" بہت اُلجھا ہوا مصرعہ تھا۔ اس کی جگہ "حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرم تماشا ہو" بنا دیا۔

"یاد ہے شادی میں عقدِ نالۂ یارب مجھے"۔ میں "عقدۂ نالۂ یارب" کی ترکیب اچھی نہ تھی۔
"یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے" کر دیا۔ "عیادت بس کہ تجھ سے گرمی بازار بستر ہے" کی جگہ ایک نہایت صاف مصرعہ رکھ دیا "خوشا اقبال رنجوری عیادت کو تم آئے ہو"

"غمِ فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو" بنا دیا۔ جو نہایت عمدہ اصلاح ہے۔

"سیلاب گریہ دشمنِ دیوار و در ہے آج" میں دشمن کی جگہ "در پے" رکھا جو یقیناً بہتر ہے۔
دل خوں شدہ کشمکش کثرت اظہار - میں کثرت اظہار کی جگہ "حسرت دیدار" کی اصلاح خوب ہے۔
غالب کا مشہور شعر ہے:- "بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل ✧ جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا" اس کا پہلا مصرعہ ابتداءً یوں تھا؟ "عشرتِ ایجادِ جہ بوئے گل دود چراغ" ظاہر ہے کہ یہ اصلاح شعر کو کس قدر بلند کر دیتی ہے۔
غرض کہ نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے یہ اندیشہ کہ غالب اپنے درجے سے گر جائیں گے، بے بنیاد ثابت ہوا بلکہ یہ نسخہ کئی اعتبار سے غالب کی شاعرانہ عظمت کو بڑھانے میں مدد ہوا مزید برآں اس سے جہاں ایک طرف غالب کے اس بیان کی تردید ہوئی کہ پچیس برس کی عمر تک جو کچھ کہا گیا تھا وہ یک قلم چاک کر دینے کے قابل تھا تو دوسری طرف مولانا محمد حسین آزاد کے بیان میں بھی ترمیم کی ضرورت لازم آئی۔ آزاد کے بیان سے گمان گزرتا تھا کہ مروجہ دیوان تمام تر منتخب کلام کا مجموعہ ہے جسے غالب کے دو عزیز دوستوں مولوی فضل حق اور مرزا خاں نے ان کے جملہ کلام سے منتخب کر کے مرتب کیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:-
"دونوں صاحبوں کے دیکھ کر انتخاب کیا وہ یہی دیوان ہے جو آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں"
جو اشعار مروجہ دیوان اور نسخۂ حمیدیہ میں مشترک ہے، اُن کی تعداد (فاتحہ فارسی کو چھوڑ کر) میرے شمار کے بموجب ۴۶۴ ہوتی ہے۔ (نسخۂ حمیدیہ میں مشترک اشعار کے آگے "م" تحریر ہے۔ مگر کافی تعداد ایسے اشعار کی بھی ہے، جن پر "م" لکھنا غالباً سہواً چھوٹ گیا ہے۔ اس لئے "عقل کام" والے اشعار کو گننے سے مشترک اشعار کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکے گی۔ مروجہ دیوان میں اس سے چوگنے اشعار ہیں۔ پس یہ کہنا صحیح نہیں کہ جو دیوان ہم آج عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں وہ تمام تر مولوی فضل حق اور مرزا خاں کا انتخاب کیا ہوا ہے۔ ممکن ہے ۱۲۳۷ھ کے بعد بھی غالب نے کچھ ایسی غزلیں کہی ہوں جن سے اشعار منتخب کئے گئے ہوں، مگر مروجہ دیوان کا بیشتر حصہ یقیناً غیر منتخب اشعار پر مشتمل ہے۔
نسخۂ حمیدیہ کے مطالعہ سے غالب کے مذہبی عقیدہ پر بھی روشنی پڑتی ہے، یوں تو اُن کے خطوط میں ان کے عقیدہ کا اظہار جا بجا ملتا ہے۔ چنانچہ مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں "صاحب بندہ اثنائے عشری ہوں ہر مطلب کے خاتمہ پر بارہ کا ہندسہ تحریر کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو، ہم تم ایک آقا کے غلام ہیں" دوسری جگہ مرزا علاء الدین کو اپنے عقیدے کے بارے میں لکھتے ہیں:- "محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ اللعالمین ہیں۔ مقطع ثبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسن ثم حسین اسی طرح مہدی موعود علیہ السلام" مگر غالباً وہ اپنے اصلی عقاید کا اعلان عام طور پر نہ کرتے تھے۔ چنانچہ نواب ضیاء الدین خاں نے جو اُن کے عزیز دوست ہونے کے علاوہ رشتہ دار بھی تھے۔ اُن کی تجہیز و تکفین اہلِ سنت کے طریقے پر کی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مخصوص دوستوں کے علاوہ وہ اوروں سے یہی کہتے تھے کہ ایک ماوراء النہری (یعنی غالب) شیعی کیسے ہو سکتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے جب اس الزام کی تردید میں کہ انھوں نے ترک مذہب آبائے نامدار کیا اور تشیع کو تسنن پر اختیار کیا" کتاب لکھی تو تقریظ لکھنے کی خدمت غالب کو سپرد کی گئی اس تقریظ میں غالب نے اپنے عقیدے کے اظہار سے نہایت خوبصورتی سے پہلو تہی کی، اور جو کچھ انھوں نے "حقیقت مذہب اہل سنت و جماعت" پر نظم میں لکھا تھا اس کی توضیح اس طرح کر دی کہ مضامین ارشاد کئے ہوئے اعلیٰ حضرت کے بموجب ارشاد قالب نظم میں ڈھلے۔ ناگاہ جانب اجانب سے اس نظم کے جواب میں کچھ وار چلے۔ یہ گناہ گار بے گناہ بھی ہ ذم ممدوح ہوا اور خنجر زبان کے زخم سے مجروح ہوا"
مگر جس والہانہ انداز سے غالب نے حضرت علی کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے اس سے اُن کے شیعی ہونے میں شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ میں نسخۂ حمیدیہ سے کچھ اشعار درج کرتا ہوں:-

یا علی یک نگاہ سوئے اسد — میں غریب اور تو غریب نواز
دھوئیں سے آگ کے اک ابر دریا بار ہو پیدا — اسد حیدر پرستوں سے اگر ہوئے دوچار آتش
اسد قدرت سے حیدر کے ہوئے ہر گبر و ترسا کو — شرارِ سنگ بت ہی بر بنائے اعتقاد آتش
غالب ہے رتبہ فہم تصور سے کچھ پرے — ہے عجز بندگی جو علی کو خدا کہوں
اسد گر نام والائے علی تعویذ بازو ہو — غریقِ بحر خوں تمثال در آئینہ رہتا ہے
اسد جہاں کہ علی بر سر نوازش ہو — کشادِ عقدۂ دشوار کار آساں ہے
کثرتِ اندوہ سے حیران مضطر ہے اسد — یا علی وقتِ عنایات و دم تائید ہے

جو حیدر پرستی کا اقرار کرے اور علی کو خدا کہنا عجز بندگی جانے اس کے عقیدے میں شک و شبہ کی گنجایش کہاں ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے سب سے بڑا فایدہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، یہ ہوا کہ ایک کافی تعداد ایسے شعروں کی مل گئی جو نظری قرار دئے جانے کے باوجود گوناگوں لطافتوں کے حامل ہیں اور ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیوں انتخاب میں نہ آئے۔ مولوی فضل حق اور مرزا خال (اگر انھوں نے انتخاب کی خدمت انجام دی) اس لحاظ سے بے شک لایق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے کنکریوں میں ملے ہوئے جواہر ریزوں میں سے بیشتر ڈھونڈ نکالے۔ نسخۂ حمیدیہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اُن کی جوہر شناس نگاہ کا قایل ہونا پڑتا ہے۔ مگر پھر بھی جواہر ریزوں کے ساتھ کچھ کنکریاں آگئیں اور کچھ جواہر ریزے چھوٹ گئے۔ معلوم نہیں مندرجۂ ذیل اشعار جن میں زبان کی ثقالت کی تلافی کے لئے بلند پروازی یا معنی آفرینی بھی نہیں کیوں منتخب کئے گئے۔

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر ناپاب تھا — تھا سپند بزم وصل غیر گو بیتاب تھا
اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں — کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا
شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست — دود شمع کشتہ تھا شاید خط رخسار دوست
میرے قدح میں ہے صہبائے آتش پنہاں — بردے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ
برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بے تابی — ہزار آئینہ دل باندھا ہے بال یک تپیدن پر
میں اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے — شعاع مہر سے تہمت نگہ کی چشم روزن پر
نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے — لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش
گردِ راہِ یار ہے سامانِ ناز زخمِ دل — ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک
ہوئی ہے مانع ذوقِ تماشا خانہ ویرانی — کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
رگ لیلےٰ کو خاک دشت مجنوں ریشگی بخشے — اگر بودے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی
میکدہ گر چشم مستِ یار سے پائے شکست — موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے
سرشک سر بہ صحرا دادہ نور العین دامن ہے — دل بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے
بہ طوفاں گاہ جوش اضطراب و شام تنہائی — شعاعِ آفتاب صبح محشر تار بستر ہے
للہ کوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی — مری طاقت کی ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

اس قسم کے ثقیل اشعار تو منتخب کئے گئے، مگر ان سے کہیں زیادہ رواں اور بلند اشعار جن کی کچھ مثالیں شروع میں دی گئی ہیں نظر انداز کر دئے گئے۔ میں نے سوا سو اشعار اپنے مذاق کے مطابق انتخاب کئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ابھی اور اشعار بھی ایسے

ہیں جو بلحاظ سلاست یا بہ اعتبار معنی لئے جا سکتے ہیں۔ مروجہ دیوان غالب میں ایسے ثقیل اشعار کے علاوہ کچھ پست اشعار بھی ہیں جیسے:۔

بغل میں غیر کے آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب گھاس کے کھودنے پر میرے درباں کا

کافی ہے نشانی تیرے چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقت سفر انگشت

دھول دھپہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو یہ خو کہیں
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کئے،

اگر سب ثقیل اور پست اشعار جن کی تعداد سو سے زیادہ نہ ہوگی خارج کر دئے جائیں اور ان کی جگہ مندرجۂ ذیل اشعار کا اضافہ کر دیا جائے اور ان غیر مطبوعہ اشعار کو بھی شامل کر لیا جائے جو غالب کے خطوط میں ملتے ہیں تو غالب کا دیوان واقعی منتخب ہو جائے۔ میں نے جو اشعار منتخب کئے ہیں ان میں بیشتر تو ایسے ہیں کہ بلحاظ ندرت خیال، شوخی بیان یا بلندی مضمون ہرگز نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرے وہ ہیں کہ وہ اتنے اچھے نہیں مگر پھر بھی انتخاب کے قابل ہیں۔ تیسرے وہ اشعار ہیں جو زیادہ اچھے نہیں مگر قابل اعتنا ہیں۔ اِن کے علاوہ اور بھی صاف اور رواں اشعار نسخۂ حمیدیہ میں ملتے ہیں، مگر چونکہ ان میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی اس لئے میں نے انھیں چھوڑ دیا۔ ا۔ دو اشعار جو نظر انداز نہیں کئے جا سکتے:۔

خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ
سرتا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا[1]

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک
شوقِ دیدار بلا آئینۂ ساماں نکلا

وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جاوے
مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

اصطلاحات اسیرانِ تغافل مت پوچھ
جو گرہ آپ نہ کھولی اُسے مشکل باندھا

ہم نے وحشت کدۂ بزم جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں باندھا

نہ پائی وسعتِ جولان یک جنوں ہم نے
عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا

کس کا خیال آئینۂ انتظار تھا
ہر برگ گل کے پردہ میں دل بے قرار تھا

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہے

بہ صورت تکلف بہ معنی تاسف
اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

ہر رنگ میں جلا اسدِ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلیِ شمع ظہور تھا

ہوں قطرہ زن بوادیٔ حسرت شبانہ روز
جز تار اشک جادۂ منزل نہیں رہا

اے آہ میری خاطر وابستہ کے سوا
دُنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہ رہا،

عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہئے اسباب تناسب تھا

آخرِ کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا،
دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

یہ دونوں شعر قلمی نسخے کے حاشیہ پر درج ہیں، یعنی ۱۲۳۷ھ کے بعد کے کہے ہوئے ہیں۔

---

[1] (نگار) آفتاب کی گرمی شبنم کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، اس لئے "ذوقِ سجود" بے محل معلوم ہوتا ہے، ممکن ہے غالب نے صعود لکھا ہو اور نقل کرنے والے نے اسے سجود کر دیا ہو۔

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

اسدؔ لے ہرزہ درا نالہ بہ غوغا تا چند،
حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا

دل و جگر تپ فرقت سے جل کے خاک ہوئے
ولے ہنوز خیالِ وصالِ خام دہا

کس بات پر مغرور ہے اے عجز تمنّا
سامانِ دُعا وحشت و تاثیرِ دُعا ہیچ

ہزار آفت و یک جان بے نوائے اسدؔ
خدا کے واسطے اے شاہِ بے کہ ان فریاد

دوستو مجھ ستم رسیدہ سے
دشمنی ہے وصال کا مذکور

× مدعی میرے صفائے دل سے ہوتا ہے خجل
ہے تماشا زشت رویوں کا عتاب آئینہ پر

×(یہ شعر حاشیہ پر درج ہے)

اے چرخ، خاک بر سرِ تعمیر کائنات
لیکن بنائے عہدِ وفا استوار پر

× ہجوم فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

×(یہ شعر حاشیے پر درج ہے)

اے اسدؔ خود ہم اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیاد ناداں ہے گرفتارِ ہوس

ہیں میری مشت خاک سے اس کو کدورتیں
پائی جگہ بھی دل میں تو ہو کر غبارِ حیف

نور سے تیرے ہے اس کی روشنی،
ورنہ ہے خورشید اک دستِ سوال

بس کہ وہ چشم و چراغ محفلِ اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمع ماتم خانہ ہم

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہ گار ہیں ہم

اسدؔ شکوہ کفر و دعا ناشناسی
ہجوم تمنا سے لاچار ہیں ہم

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا،
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

× ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

×(یہ شعر حاشیہ پر درج ہے)

میں چشم وا کشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں،

سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا،
یارب میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں

مگر آتش ہمارا کوکبِ اقبال چمکا دے
وگرنہ مثلِ خارِ خشک مردودِ گلستاں ہیں

اسدؔ بزمِ تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ ہم تصویرِ عریاں ہیں

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
برنگِ جادہ سرِ کوئے یار رکھتے ہیں

ہے طلسمِ دہر میں صد حشر پاداشِ عمل
آگہی غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں،

کوئی آگاہ نہیں باطنِ یک دیگر سے
ہے ہر اک فردِ جہاں میں ورقِ ناخواندہ

شکوۂ و شکر کو اثرِ بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب دل نہ سمجھ بلا سمجھ

گاہ بخلد اُمید وار گہ بہ جحیم بیم ناک
گرچہ خدا کی یاد ہے کلفتِ ماسوا سمجھ

ہستی فریب نامۂ موجِ سراب ہے
یک عمر ناز شوخیِ عنواں اُٹھائیے

خوشا دہ دل کہ سراپا طلسم بے خبری ہو
جنون و یاس و الم رزقِ مدعا طلبی ہے

بے چشم دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق ورقِ انتخاب ہے،

اسدؔ اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرایش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمون عالی ہے

ہم مشقِ تکرہِ وصل و غم ہجر سے اسدؔ
لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو
وہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

غالبؔ زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
ہر ذرہ چشمکِ نگہِ ناز ہے مجھے

نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو
زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے

تپش تو کیا نہ ہوئی عشق پر فشانی بھی
رہا میں ضعف سے شرمندۂ نو آموزی

بس کہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق
ہر بتِ خورشید طلعت آفتابِ بام ہے ×

×(یہ شعر حاشیے پر درج ہے)

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا،
آسماں سے بادۂ گل فام گو برسا کرے

دام گاہِ عجز میں سامان آسایش کہاں
پر فشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے

شورشِ باطن سے یاں تک مجھ کو غفلت ہے کہ آہ
شیونِ دل ایک سرودِ خانۂ ہمسایہ ہے

نوائے خفتۂ الفت اگر بے تاب ہو جائے
پرِ پروانہ تارِ شمع پر مضراب ہو جائے

تا چند ناز مسجد بت خانہ کھینچیے
جوں شمع دل بخلوتِ جانانہ کھینچیے

گل سر بسر اشارۂ جیب دریدہ ہے
نازِ بہار جز بہ تقاضا نہ کھینچیے

واماندۂ ذوقِ طرب وصل نہیں ہوں
اے حسرتِ بسیار تمنا کی کمی ہے

زندانِ تحمل میں مہانِ تغافل ہیں
بے فایدہ یاروں کو فرقِ غم و شادی ہے

نہ حیرتِ چشمِ ساقی کی نہ صحبت دورِ ساغر کی
میری محفل میں غالبؔ گردشِ افلاک باقی ہے

۲۔ وہ اشعار جو اچھے خاصے اور انتخاب کے قابل ہیں:-

پوچھا تھا گرچہ یار نے احوال دل مگر
کس کو دماغِ منتِ گفت و شنید تھا

بازی خورِ فریب ہے اہلِ نظر کا ذوق
ہنگامہ گرمِ حیرتِ بود و نبود تھا

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا

شورِ رسوائیِ دل دیکھ کہ یک نالۂ شوق
لاکھ پردے میں چھپا پھر وہی عریاں نکلا

شوخیِ رنگِ حنا خونِ وفا سے کب تک
آخر اے عہد شکن تو بھی پشیماں نکلا

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا
اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

درس تپش ہے برق کو اب اس کے نام سے
وہ دل کہ ہے کہ جس کا تخلص صبور تھا

ہر چند ہوں میں طوطیِ شیریں سخن ولے
آئینہ آہ میرے مقابل نہیں رہا

اے خوشا ذوقِ تمنائے شہادت کہ اسدؔ
بے تکلف بہ سجودِ خمِ شمشیر آیا

استدارِ بابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاقِ تحسیں کا

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی اسدؔ
نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا

نہ پوچھ حالِ شب و روزِ ہجر کا غالبؔ
خیالِ زلف رُخِ دوست صبح شام رہا

× دو عالم کی ہستی پہ خط دنا کھینچ — دل دوست اربابِ ہمت سلامت
× نہ فکرِ سلامت نہ بیمِ ملامت — زخود رفتگی ہائے حیرت سلامت
× رہے غالبِ خستہ مغلوب گردوں — یہ کیا بے نیازی ہے حضرت سلامت

×(یہ اشعار حاشیہ پر درج ہیں)

جب کہ نقشِ مدعا ہوئے نہ جز موجِ سراب — دادیٔ حسرت میں پھر آشفتہ سامانی عبث
اے اسدِ بے جا ہے نازِ سجدۂ عرض نیاز — عالمِ تسلیم میں یہ دعویٰ آرائی عبث
تو پستیٔ فطرت اور خیالِ بسا بلند — اے طفلِ خود معاملہ قدسے عصا بلند
غرورِ ضبطِ وقت نزع ٹوٹا بے قرارانہ — نیاز بال افشانی ہوا صبر و شکیب آخر
گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی — سرخوش خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز
کون آیا جو چمن بیتاب استقبال ہے — جنبشِ موجِ صبا ہے شوخیِ رفتارِ باغ
نامہ بھی لکھتے ہو تو بخطِ غبار حیف — رکھتے ہو مجھ سے اتنی کدورت ہزار حیف
تھی میرے ہی جلانے کو اے آہ شعلہ ریز — گھر پر گرا نہ غیر کے کوئی شرار حیف
آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک — لایا ہے لعلِ بیش بہا کاروانِ اشک
رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایکبار — مژگاں کو دوں نثار پئے امتحانِ اشک
مژگاں تلک رسائیٔ لختِ جگر کہاں — اے وائے گر نگاہ نہ ہو آشنائے گل ×

×(یہ اشعار حاشیے پر درج ہیں)

نہ ذوقِ گریباں نہ پروائے دامن — نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم
کرنے نہ پائے ضعف سے شورِ جنوں اسدؔ — اب کے بہار کا یونہی گزرا برس تمام
میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ — جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں
ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن — قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن
وقت ہے گر بلبلِ مسکیں زلیخائی کرے — یوسفِ گل جلوہ فرما ہے بہ بازارِ چمن
ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا — اب اُس سے ربط کروں جو بہت ستمگر ہو
صدف کی ہے تیرے نقشِ قدم میں کیفیت — سرشکِ چشمِ اسدؔ کیوں نہ اس میں گوہر ہو
واسطے فکرِ مضامین و تفکر کے غالبؔ — چاہئے خاطرِ جمع و دلِ آرا سیدہ
دخترِ درد بے کسی بے اثر اس قدر نہیں — رشتۂ عمرِ خضر کو نالۂ "رسا سمجھ
نے سرو برگ آرزو نے رہ و رسمِ گفتگو — اے دل و جانِ خلق تو ہم کو بھی آشنا سمجھ
کرتے ہو شکوہ کس کا تم اور بے وفائی! — سر پٹختے ہیں اپنا ہم اور ننگ نامی
ہر چند عمر گزری آزردگی میں لیکن — ہے شرحِ شوق کو بھی جوں شکوہ ناتمامی
کثرتِ جور و ستم سے ہو گیا ہوں بے داغ — خوبرویوں نے بنایا غالبِ بدخو مجھے
یک بار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے — اے جوشِ عشق بادۂ مرد آزما مجھے
بیادِ گرمیٔ صحبت برنگِ شعلہ دہکے ہے — چھپاؤں کیونکہ غالبؔ سوزشیں داغِ نمایاں کی

اسدؔ جمعیت دل درکنار بے خودی خوشتر
پیدا کریں دماغِ تماشائے سرو و گل

ساقی بہار موسمِ گل ہے سرور بخش
نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ

پراگندہ ہو گئے شعلے ہزاروں
بت خانہ میں اسدؔ بھی بندہ تھا گاہ گاہ

× یقیں ہے آدمی کو دستگاہِ فقر حاصل ہو
(× یہ شعر حاشیے پر درج ہے)

جنوں فسردۂ تمکیں ہے، کاش عہد وفا
بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ تو پھر

جس طرف سے آئے ہیں آخر اُدھر ہی جائیں گے
× رنگ گل اگر شیرازہ بند بے خودی رہتے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
خود نامہ بن کے جائے اس آشنا کے پاس

چمن زار تمنا ہو گئی صرف خزاں لیکن
لالہ و گل بہم آئیشہ اخلاق بہار

وداع حوصلہ توفیقِ شکوہ عجز و فا
گدائے طاقت تقریر ہے زباں تجھ سے

شعر کی فکر کو اسدؔ چاہیے ہے دل و دماغ

دو عالم آگہی سامانِ یک خواب پریشاں ہے
حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے

پیماں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

رہے ہم داغ اپنی کاہلی سے
حضرت چلے حرم کو اب آپ کا خدا ہے

دم تیغ توکل سے اگر پائے سبب کاٹے

گداز حوصلہ کو پاس آبرو جانے
کیوں نہ دلی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

مرگ سے وحشت نہ کر راہ عدم پیمودہ ہے
ہزار آشفتگی مجموعہ یک خواب ہو جائے

دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے
کیا فایدہ کہ سنتِ بیگانہ کھینچیے

بہار نیم رنگ آہ حسرت ناک باقی ہے
ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا ہے مجھے

اسدؔ ہنوز گمان غرور دانائی
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

عذر کی یہ فسردہ دل بے دل و بے دماغ ہے

نسخۂ حمیدیہ کے کچھ اور اشعار جو زیادہ اچھے نہیں مگر قابل اعتنا ہیں :-

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا
فراغت گاہِ آغوشِ وداع دل پسند آیا

اسدؔ ہر جا سخن نے طرح باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیِ بیدل پسند آیا

تنگی رفیق رہ تھی عدم یا وجود تھا
میرا سفر بہ طالع چشم حسود تھا

کارخانہ سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا
میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا

کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں یارب
نقش ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا

مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالبؔ
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

واں ہجوم نغمہ ہائے ساز عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تار نفس مضراب تھا

دیکھتے تھے جب بچشم خود وہ طوفانِ بلا
آسمان سفلہ جس میں یک کف سیلاب تھا

بے خبرمت کہ ہمیں بیدرد، خود بینی سے پوچھ
قلزم ذوقِ نظر میں آئینہ پایاب تھا

نہ بھولا اضطراب دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

اگر آسودگی ہے مدعائے رنج بے تابی
نثار گردش پیمانۂ روزگار اپنا

اسد یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعوے ہے خدائی کا

نگاہِ چشمِ حاسد دام لے لے ذوقِ خود بینی
تماشائی ہوں وحدت خانۂ آئینۂ دل کا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامۂ بیدل کا

شاید کہ مر گیا ترا رخسار دیکھ کر
پیمانہ رات ماہ کا لبریزِ نور تھا

طاؤس در رکاب ہے۔ ہر ذرہ آہ کا
یارب نفس غبار ہے کس جلوہ گاہ کا

عزلت گزینِ بزم ہیں واماندگانِ دید
مینائے مے ہے آبلہ پائے نگاہ کا

خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا
بے کسی میری شریک۔ آئینہ تیرا آشنا

شمع رویوں کی سرانگشت حنائی دیکھ کر
غنچۂ گل پرفشاں پروانہ آسا جل گیا

بوئے یوسف مجھے گلزار سے آتی تھی اسدؔ
دم نے برباد کیا پیرہنستاں میرا

رکھا غفلت نے دور افتادہ ذوقِ فنا ورنہ
ہماری فہم کو ہر ناخنِ برہانِ ابرو تھا

دیکھ اس کی ساعد بین و دست پُر نگار
شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمع۔ گل پروانہ تھا

دیوانگی اسدؔ کی حسرت کشِ طرب ہے
در سرِ ہوائے گلشن۔ در دل غبارِ صحرا

بسکہ وقتِ گریہ نکلا تیرہ کاری کا غبار
دامنِ آلودۂ عصیاں گراں تر ہو گیا

بنگ شیشہ توڑوں ساقیا پیمانۂ پیماں
اگر ابرِ سیہ مست از سوئے کہسار ہو پیدا

اسدؔ مایوس مت ہو گرچہ رونے میں اثر کم ہے
کہ غالبؔ ہے کہ بعد از زاریِ بسیار ہو پیدا

جاتا ہوں جدھر سب کی اٹھی ہے ادھر انگشت
یکدست جہاں مجھ سے چھڑا ہے مگر انگشت

ہر غنچۂ گل صورتِ بک قطرۂ خوں ہے
دیکھا ہے کسی کا جو حنا بستہ سرانگشت

شاخِ گل جنبش میں ہے گہوارہ آسا ہر نفس
طفلِ شوخ غنچۂ گل بسکہ ہے وحشت مزاج

خمارِ منتِ ساقی اگر یہی ہے اسدؔ
دلِ گداختہ کے سیکدے میں ساغر کھینچ

بے دل بہ ناز وحشتِ جیب دریدہ کھینچ
جوں بوئے غنچہ یک نفسِ آرمیدہ کھینچ

برقِ بہار سے ہوں میں پا در حنا ہنوز
اے خار دشت دامنِ شوقِ رمیدہ کھینچ

ہم نے سوزِ غمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد

تیغ در کف، کف بلب آتا ہے قاتل اسطرف
مژدہ باد اے آرزوئے مرگِ غالبؔ مژدہ باد

موقوف کیجئے بہ تکلف نگاریاں
ہوتا ہے ورنہ شعلۂ رنگِ حنا بلند

بالیدگی نیازِ قدِ جانفزا اسدؔ
در ہر نفس۔ بقدرِ نفس ہے قبا بلند

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں۔ ورنہ
برنگِ نے ہے نہاں در ہر استخواں فریاد

ہلاکِ بے خبریِ نغمۂ وجود و عدم
جہاں۔ اہلِ جہاں سے جہاں جہاں فریاد

ہلال آسا تہی رہ گر کشادن ہائے دل چاہے
ہوا منہ کثرتِ سرمایہ اندوزی سے تنگ آخر

کیجے جوں اشک ادر قطرہ زنی
اے اسدؔ ہے ہنوز دلی دور،

دل کو توڑا جوششِ بیتابی سے غالبؔ کیا کیا
رکھ دیا پہلو بوقتِ اضطراب آئینہ پر

جوں جادہ سر بکوئے تمنائے بے دلی
زنجیر پا ہے رشتۂ حبِ وطن ہنوز

فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ
آشنا غالب نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا
ہوتے ہیں نیست جلوۂ خور سے سیارگاں[1]
گل چہرہ ہے کسی خفقانی مزاج کا
بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے
فلکِ سفلہ بے محابا ہے
کسی کو زخود رستہ کم دیکھتے ہیں
ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
کب تلک پھیرے اسد لب ہائے تفتہ پر زباں
رنجشِ دل یک جہاں ویراں کرے گی اے فلک
واں پرفشانِ دامِ نظر ہوں جہاں اسد
مجھے معلوم ہے جو تو نے مرے حق میں سوچا ہے
دہلی کے رہنے والو اسد کو ستاؤ مت
پہلو تہی نہ کر غم و اندوہ سے فلک
نظر بہ نقصِ گدایاں کمال بے ادبی ہے
امام ظاہر و باطن - امیر صورت و معنی
تا چند پست فطرتیِ طبعِ آرزو،
ہمیشہ مجھ کو طفلی میں بھی مشقِ تیرہ روزی تھی
ہوا ہے مانعِ عاشق نوازی نازِ خود بینی،
اسد بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
دیوانگاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق
آتش افروزیِ یک شعلۂ ایما تجھ سے
بسکہ ویرانی سے کفرِ دیں ہوئے زیر و زبر
لے سر شوریدہ - ناز عشق و پاسِ آبرو
ہو سکے کیا خاک دست و بازوئے فرہاد سے
اسد بہارِ تماشائے گلستانِ حیات
جائے استہزا ہے، عشرت کوشیٔ ہستی اسد
تمثالِ جلوہ عرض کرے حسن کب تلک
عرضِ سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ
میں ہوں اور حیرتِ جاوید مگر ذوقِ خیال
ہمارا دیکھنا گر ننگ ہے سیرِ گلستاں کر

نگاہِ عکس فروش و خیالِ آئینہ ساز
ورنہ کس کو میرے افسانے کی تابِ استماع
دیکھ اس کو دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ
گھبرا رہی ہے بیمِ خزاں سے بہارِ حیف
وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم
اس ستمگر کو انفعال کہاں
کہ آہو کو پابندِ رم دیکھتے ہیں
عزلت آبادِ صدف میں قیمت گوہر نہیں
طاقتِ لب تشنگی اے ساقیِ کوثر نہیں
دشت ساماں ہے غبارِ خاطرِ افسردگاں
صبحِ بہار بھی قفسِ رنگ و بو نہ ہو
کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی
بے چارہ چند روز کا یاں میہمان ہے
دل و قفِ درد کر کہ فقیروں کا مال ہے
کہ خارِ خشک کو بھی دعوئے چمن نسبی ہے
علی ولی اسد اللہ جانشینِ نبی ہے
یارب ملے بلندیِ دست دعا مجھے
سیاہی ہے مرے ایام میں لوحِ دبستاں کی
تکلف برطرف آئینۂ تمییز حائل ہے
اگر وا ہو تو دکھلاؤں کہ یک عالم گلستاں ہے
اے بے تمیز گنج کو ویرانہ چاہیئے
چشمک آرائیٔ صد شہر چراغاں مجھ سے
گردِ صحرائے حرم تا کوچۂ زنار ہے
یک طرف سودا و یک سو منت دستار ہے
بے ستوں خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے
وصالِ لالہ غدارانِ سرو قامت ہے
صبح و شبنم فرصتِ نشو و نمائے خندہ ہے
آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی،
صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی
یہ فسونِ نگہِ ناز ستاتا ہے مجھے
شرارِ آہ سے موجِ صبا دامانِ گلچیں ہے

---

[1] (نگار) حیرت ہے کہ غالب سیارہ کو سیارہ، بغیر تشدید کے استعمال کرے۔

منت کشی میں حوصلہ بے اختیار ہے
خجلت کشِ وفا کو شکایت نہ چاہئے

کس فرصتِ وصال پہ ہے گل کو عندلیب
رشک ہے آسایشِ ارباب غفلت پر اسد

موجِ تبسّم لب آلودۂ مسی
اسد دارستگاں باوصف سامان بے تعلق ہیں،

شوخیِ چشمِ حبیب ۔ فتنۂ ایام ہے
دیکھ لے جوشِ جوانی کی ترقی بھی کہ اب

طلسمِ آئینہ زانوئے فکر ہے غافل
دامانِ دل یہ وہم تماشا نہ کھینچئے

پرطاؤس تماشا نظر آیا ہے مجھے
حیرتِ کاغذِ آتش زدہ ہے جلوۂ عمر

عالم ہر ذرّہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
خرابِ نالۂ بلبل ۔ شہیدِ خندۂ گل

وہ تشنہ سرشارِ تمنا ہوں کہ جس کو

دامانِ صد کفن نہ سنگِ مزار ہے
اے مدعی ۔ طلسمِ عرق بے غبار ہے

زخمِ فراق ۔ خندۂ بے جا کہیں جسے
پیچ و تابِ دل ۔ نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

میرے لئے تو تیغِ سیہ تاب ہوگئی
صنوبر گلستاں میں ! دلِ آزادہ آتا ہے

قسمتِ بختِ رقیب گردشِ صد جام ہے
بدر کی مانند کاہش روز افزوں ہے مجھے

ہنوز حسن کی ہے سعی جلوہ اندوزی
اے مدعی خجالتِ بے جا نہ کھینچئے

ایک دل تھا کہ بصد چشم دکھایا ہے مجھے
تہ خاکسترِ صد آئینہ پایا ہے مجھے

کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہی مجھے
ہنوز دعوئے تمکین و بیم رسوائی

ہر ذرہ بہ کیفیتِ ساغر نظر آوے

(اُردو ادب)

حبیب احمد صدیقی

نگار بک ایجنسی کی کتابیں

اُردو کے ساتھ ہندی اور انگریزی کتابیں بھی آنا چاہئے

محاسن کلام غالب = از ڈاکٹر بجنوری مرحوم ---- عہ
حیات سرسید = از نورالرحمان بی۔ اے ---- ۸ے
حیات اجمل = از قاضی عبدالغفار (مجلد) -- ۸ے
یادگار حالی = از صالحہ عابد حسین ---- للعہ ۴ے
ادبی و قومی تذکرے = از پنڈت کشن پرشاد کول --- ۸ے
مداوا = فرقت کی طنزیہ نظموں کا مجموعہ --- للعہ
مقدمۂ شعر و شاعری = از حالی ---------- عا
نقدالادب = از حامد اللہ افسر ---------- ۸ع
ناول کی تاریخ و تنقید = از علی عباس حسینی ---- ۸ے
تاریخ امریکہ = از محمد یحییٰ تنہا ---------- ۸ع
ادبی تبصرے = از مولوی عبدالحق صاحب -- عہ

اُردو کے ساتھ ہندی اور انگریزی کتابیں بھی آنا چاہئے

دور جدید کے مختلف ہندو شعراء = عبدالشکور ام۔ اے --- ۸ے
چھان بین (تنقید) = اثر لکھنوی ---------- ۸ے
آبِ بقا (تذکرۂ شعرا) = عشرت لکھنوی ------ عا
ہندو شعراء (تذکرہ) = عشرت لکھنوی ------ عہ
لغات المصادر اُردو = عشرت لکھنوی ------ ۴ے
شاعری کی چار کتابیں = عشرت لکھنوی ------ ۴ع
اُردو کی عشقیہ شاعری = فراق گورکھپوری ---- ۱۲ع
مشعل = انتخاب کلام فراق گورکھپوری ---- ۱۲ع
حاشئے و تنقید = = فراق گورکھپوری ---- ۱۲عہ
افادۃ الاسلام (ردِّ قادیانیت) علامہ انوار اللہ شاہ --- صہ
تذکرہ کاملانِ رامپور = شوق رامپوری ---- صہ

مذاہبِ عالم کی تخلیق اور قطب شمالی

۱- پیدائشِ عالم

تمہید اس دُنیا کا پیدا کرنے والا کون ہے اور یہ دنیا کیونکر پیدا ہوئی، یہ سوال دنیا کی مختلف اقوام کے مفکرین کے سامنے آیا اور اُنھوں نے اپنی اپنی معلومات اور سمجھ کے مطابق اس کا جواب دینے کی کوشش کی۔ آج کل بھی علم طبیعیات اور فلسفہ میں "آفرینشِ عالم" ایک نہایت ہی اہم موضوع ہے لیکن علومِ مذکورہ کے ماہر ابھی تک کسی یقینی فیصلہ پر نہیں پہونچ سکے ہیں۔

زمانۂ قدیم اور زمانۂ موجودہ کی مہذب اور نیم مہذب اقوام کے مذہبی ادب کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مذاہب کے بانیوں نے بھی اس مسئلہ پر کافی غور کیا تھا۔ اور میں اُن کے تکوینی نظریوں کا تجزیہ اور تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ اُن میں سے اکثر کا تعلق قطب شمالی سے ہے۔

اس سے قبل بتایا جاچکا ہے کہ تاریخی عہد سے پہلے بحرِ آرکٹک میں ایک جزیرہ موجود تھا (جو اب غرقاب ہے) مذاہبِ عالم کے تکوینی نظریوں کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جزیرہ اُسی نوع کا تھا جو سمندروں میں طبقات الارضی اسباب کی بناء پر ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں یعنی جب زمین کے اندرونی مادے میں خلفشار پیدا ہوکر لاوا اُبل پڑتا ہے تو وہ دھیرے دھیرے ٹھنڈا ہوکر جزیرے کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد تہ آب ہوجاتا ہے۔

میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ تاریخی عہد سے پہلے بعض قومیں بحرِ آرکٹک کے اطراف میں آباد تھیں اور اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے قطبی جزیرے کو پانی سے نمودار ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور جب وہ جزیرہ ٹھنڈا ہوگیا اور نباتات سے ڈھک گیا تو وہ اُس میں جاکر آباد ہوگئیں اور چونکہ پُرانے زمانہ میں انسان کو ساری زمین کا علم نہ تھا بلکہ جو قوم کرۂ ارض کے جس حصہ میں آباد تھی اُسی کو اپنی "دنیا" سمجھتی تھی۔ اس لئے اُن اقوام کے نزدیک جو قطبی جزیرے میں آباد تھیں قطبی جزیرہ ہی اُنکی دنیا تھی اور اُن میں دُنیا کی پیدائش سے متعلق وہی نظریہ پایا جاتا تھا جو قطبی جزیرے کی پیدائش سے متعلق تھا یعنی شروع میں پانی ہی پانی تھا اور پانی سے زمین نمودار ہوئی اور جب یہ قومیں قطبی جزیرے سے ہجرت کرکے اطرافِ عالم کے دوسرے حصوں میں گئیں تو اس روایت کو بھی اپنے ساتھ لیتی گئیں۔

قطب شمالی سے ہجرت کرنے کے بعد جتنا زمانہ گزرتا گیا مہاجرین کے دلوں سے قطبی جزیرے کی یاد محو ہوتی گئی۔ یہانتک کہ جب اُن کی تیس چالیس پشتیں گزرگئیں تو قطبی جزیرے کے خدوخال اُن کے حافظہ کی لوح میں بالکل ہی پھیکے پڑگئے اور جب یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ دُنیا کیونکر پیدا ہوئی تو بہت ہی کم لوگ ایسے نکلے جو اس کا صحیح صحیح جواب دے سکتے تھے اور جن لوگوں نے اس کا جواب دیا وہ کوئی اُن کے ذاتی غور و خوض کا نتیجہ نہ تھا اور نہ اُنھیں یہ بات الہام سے معلوم ہوئی تھی بلکہ پیدائشِ عالم

سے متعلق ان کے یہاں ایک روایت چلی آرہی تھی جو واقعتاً قطبی جزیرے سے متعلق تھی لیکن اب اُسے اُس ملک کی پیدائش کے بارے میں بیان کیا جانے لگا جس میں وہ قوم آباد تھی کیونکہ وہ قطبی جزیرے کو فراموش کر چکی تھی اور اس نئے ملک نے "اپنی دنیا" کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس طرح پیدائش عالم کی وہ روایت جو اصل میں قطبی جزیرے سے متعلق تھی کرۂ ارض کے مختلف ملکوں کی پیدائش کے بارے میں بیان کی جانے لگی اور چونکہ اُن سب کا اصل ماخذ ایک تھا اس لئے ان نظریوں میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔

اپنے مذکورہ دعوے کو ثابت کرنے کے لئے میں ہر قوم کے تکوینی نظریوں کا جایزہ لوں گا اور یہ دکھاؤں گا کہ اُن کا قطبی جزیرے سے کیا تعلق ہے لیکن اس سے پہلے کچھ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ اگر ناظرین یہ توقع کرتے ہیں کہ جن تکوینی نظریوں کا میں ذکر کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت ہی اعلیٰ فلسفیانہ خیالات کے حامل ہوں گے تو اُن کی یہ توقع پوری نہ ہوگی۔ میں پہلے ہی سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ بعض صورتوں میں تو یہ نظریئے بچوں کے ایسے بھولے بھالے خیالات پیش کرتے ہیں۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بہت سے تکوینی نظریوں پر ناظرین کو ہنسی آئے گی لیکن میرے خیال میں اُن پر ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اُنھیں عقل کی ترازو میں تولنے کی ضرورت ہے اور یہ معلوم کرنے کی کہ میں نے اُن سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ کہاں تک قابلِ قبول ہیں۔

آخر میں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان مذہبی نظریوں کے مطابق دنیا عدم سے وجود میں نہیں آتی بلکہ بہت سی چیزوں کو پہلے سے موجود مان لیا جاتا ہے خاص کر آسمان، پانی اور بعض دیوتا جو زمین سورج اور چاند وغیرہ کو بناتے ہیں۔ ان تمہیدی الفاظ کے بعد ہم اپنے اصل موضوع پر آتے ہیں۔

جاپانی تکوینی نظریہ

ہمیں اہلِ جاپان کے تکوینی نظرئے کا علم اُن کی پرانی کتابوں کوجی کی اور نی ہونگی سے معلوم ہوتا ہے جو بالترتیب ۷۱۲ء اور ۷۲۰ء کی تالیف ہیں۔ ان میں جاپان کی پیدائش کی جو صورت بیان کیگئی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے:-

تخلیق عالم سے پہلے زمین اور آسمان کا وجود نہ تھا البتہ وہ مادہ ضرور موجود تھا جس سے زمین اور آسمان بنائے جانے والے تھے یہاں تک کہ لطیف مادہ کثیف مادہ سے آہستہ آہستہ جدا ہوگیا اور اُس نے آسمان کی صورت اختیار کر لی لیکن کثیف مادے کو زمین بننے میں کافی دیر لگی

پھر عرشِ معلیٰ کے میدان میں بہت سے دیوتا پیدا ہوئے جن میں سب سے اول اور سب سے بلند مرتبت "آسمان کے محترم مرکز کا مالک دیوتا" تھا۔ آسمان کے نیچے پانی تھا جو تیل کی طرح گاڑھا اور فالودے کی طرح لیلیا تھا اور اُس پر کوئی چیز تیرتی تھی (شاید کیچڑ یا مٹی) جس کا مقابلہ بادل سے کیا جا سکتا ہے۔

آسمان اور پانی کے درمیان (یا پانی پر تیرنے والے بادل پر) ایک فلک بوس نازک نرکل اُگتا تھا جس نے بعد میں ایک دیوتا کی شکل اختیار کر لی (یا بعد میں اُس سے ایک دیوتا پیدا ہوا) اور پھر اُس نرکل دیوتا نے بہت سے دیوتاؤں کو جنم دیا سب سے آخر میں اظناگی اور ازانامی پیدا ہوئے اور بڑے دیوتاؤں نے اُنھیں زمین بنانے کے لئے بھیجا اور اس کام کے لئے اُنھیں ایک مرصع نیزہ دیا۔

ازاناگی نے (اور ازانامی اُس کے ساتھ تھی) آسمان کے تیرنے والے پُل کے بیچ میں کھڑے ہو کر نیزہ کو سمندر میں ڈال دیا اور ایک روایت کے مطابق وہ بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ سمندر کی تہہ سے جا لگا۔ پھر ازاناگی نے اُس نیزہ کو خوب گھمایا اور جب اُسے باہر نکالا تو (کیچڑ کے) وہ قطرے جو اُس کے سرے سے ٹپکے جم کر ایک جزیرہ بن گئے اسی لئے اُسے اونو گورو جیما یعنی "منجمد قطروں کا جزیرہ" کہتے ہیں۔ یہ جزیرہ دنیا کی چوٹی پر تھا اور اُسے دنیا کا مرکز بتایا جاتا ہے۔

پھر ازاناگی اور ازانامی اُس جزیرے میں اُترے اور نیزے کو نوک کی طرف سے زمین میں گاڑا اور اُسے چھت کا مرکزی ستون بنا کر اُس کے گرد ایک محل بنایا جس میں وہ میاں بیوی کی طرح رہنے لگے اور وہ مرکزی ستون زمین کا محور بن گیا جو گول گول گھمانے کی بنا پر گردش کرتا ہے۔

منجمد قطروں کے جزیرے کے بعد ازاناگی اور ازانامی نے کئی اور جزیرے پیدا کئے یہاں تک کہ جاپان کے پورے آٹھ جزیرے بن گئے اور پھر اُنھیں پہاڑوں، دریاؤں اور جنگلوں وغیرہ سے ڈھک دیا۔

جاپانی تکوینی نظریئے کا خلاصہ پیش کرنے کے بعد اب ہم اُس کی اصلیت پر غور کریں گے۔ سب سے پہلے تو غور کرنے کی چیز "آسمان کے محترم مرکز کا مالک دیوتا" ہے۔ میرے خیال میں (اور یہی رائے ڈاکٹر واٹسن کی بھی ہے) اس سے قطب ستارہ مراد ہے کیونکہ پرانے زمانہ میں قطب ستارے کو آسمان کا مرکز مانا جاتا تھا برایں بنا کہ تمام ستارے اُس کا طواف کرتے ہیں اور وہ اپنی جگہ پر قایم رہتا ہے۔ اسے میں اور واضح کر کے سمجھاؤں گا۔ آپ کو یہ معلوم ہے کہ زمین چوبیس گھنٹے میں ایک دفعہ اپنے محور پر گھوم جاتی ہے اور اُس کا جو حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے اُدھر دن ہوتا ہے اور جو حصہ سورج کے پیچھے ہوتا ہے اُدھر رات ہوتی ہے۔ پھر جس طرح آپ ریل پر سفر کرتے ہیں تو ریل ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی ہے اور باہر کی چیزیں بھاگتی ہوئی معلوم پڑتی ہیں ——— بالکل اُسی طرح اگر آپ رات کو آسمان کا مشاہدہ کریں تو معلوم ہوگا کہ زمین ٹھہری ہوئی ہے مگر آسمان معہ اپنے تمام ستاروں کے مغرب سے مشرق کو گھوم رہا ہے۔ یہ چیز یہاں پر اتنی واضح نظر نہیں آتی جتنی کہ قطب شمالی پر معلوم پڑتی ہوگی کیونکہ وہاں پر چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے اور چھ مہینے کی رات میں آسمان اوزانہ یعنی چوبیس گھنٹوں میں ایک چکر پورا کرتا ہوا معلوم ہوتا ہوگا۔ اسی بناء پر قدماء نے "سکوتِ زمین اور حرکتِ افلاک" کا نظریہ قایم کیا اور میرے خیال میں یہ نظریہ قطب شمالی کی پیداوار ہے۔ بہرحال قطب ستارے کے ثبات نے اُسے خدا بنا دیا اور نہ صرف اہلِ جاپان بلکہ اور اقوام بھی قطب ستارے کو خدا ماننے لگیں۔

آسمان کے محترم مرکز کے دیوتا کے بعد ہم نرکل دیوتا پر غور کریں گے۔ اُس کے کوجی کی میں کئی نام ہیں مثلاً "خوشنا نرکل کی کونپل کا شہزادہ اور بزرگ دیوتا"، "ازل سے آسمان میں کھڑا رہنے والا دیوتا" اور "ازل سے زمین پر کھڑا رہنے والا دیوتا"۔ میرے خیال میں اس سے مراد زمین کا محور ہے۔ یوں تو محور اُس فرضی خط کو کہتے ہیں جس پر زمین گردش کرتی ہے، جو زمین کے شمالی اور جنوبی سروں کو ملاتا ہے۔ اگر اُس کے شمالی سرے کو آسمان کی طرف بڑھاتے چلے جائیں تو وہ قطب ستارے سے جا ملے گا لیکن پرانے زمانہ میں اُس نے ایک مرئی صورت اختیار کر لی ہوگی کیونکہ جس وقت قطبی جزیرہ (جو ٹھیک قطب ستارے کے نیچے تھا) نمودار ہو رہا ہوگا تو بحرِ آرکٹک کے مرکز سے ایک دھوئیں کے باریک خط کو آسمان کی طرف بلند ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہوگا جو آسمان اور پانی کو ملاتا ہوا معلوم پڑا ہوگا۔ بھی تو اُسے ایک سماوی چیز مان کر کہا جاتا تھا کہ "ازل سے آسمان میں کھڑا رہنے والا دیوتا" اور کبھی اُسے زمین کی چیز مان کر کہا جاتا تھا "ازل سے زمین پر کھڑا رہنے والا دیوتا"۔ اور اُس وخانی خط کو طول کی بنا پر نرکل سے استعارہ کیا جاتا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا اس نرکل کا تخیل اور اقوام میں بھی پایا جاتا ہے۔ سو مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اتھروید میں کہیں پڑھا تھا کہ "جو پانی میں ایستادہ سنہرے نرکل کو جانتا ہے وہ پُراسرار ہو جاتا ہے"۔ مجھے افسوس ہے کہ عدیم الفرصتی کی بنا پر میں پورا حوالہ نہیں دے سکتا کہ میرے خیال میں اس سے مراد زمین کا محور ہے اور یہی سنہرا نرکل وشنو جی کی ناف سے اُگنے والا کنول ہے۔ یہاں پر میں ناظرین کی توجہ شکل نمبر ۱ کی طرف مبذول کروں گا جس میں وشنو بھگوان کو شیش ناگ پر لیٹے ہوئے دکھایا گیا ہے اُن کی ناف سے ایک کنول اُگا ہوا ہے جس پر برہما جی بیٹھے ہیں۔ وشنو جی کے برابر ہی اُن کی بیوی لکشمی جی بیٹھی ہیں جو اُن کے

پیرو بار ہی ہیں - اصل میں یہ تصویر سرشٹی یعنی پیدائش عالم سے متعلق ہے - ہندوؤں میں آفریدگار دیوتا کا نام برہما ہے - برہما وشنو جی کی ناف سے اُگنے والے کنول سے پیدا ہوتے ہیں اور تکوینِ عالم کا کام کرتے ہیں بالکل اُسی طرح جیسے جاپان میں "نرکل دیوتا" سے ازاناگی اور ازانامی پیدا ہوتے ہیں اور دنیا کو بناتے ہیں -

برہما کا مقابلہ اہلِ مصر کے ہورس دیوتا سے کیا جاسکتا ہے جس کا کنول یا سرکنڈے سے پیدا ہونا ظاہر کیا جاتا ہے - (دیکھئے شکل نمبر ۲ اور ۳)

اسی طرح جنوبی افریقہ کے کافر لوگوں میں بھی ایک نرکل کا تخیل پایا جاتا ہے جس کے چیرنے سے پہلا مرد اور پہلی عورت برآمد ہوئے تھے (ان کا مقابلہ جاپانیوں کے ازاناگی اور ازانامی سے کرئے) اور ایک روایت کے مطابق جو مرد اُس نرکل سے نکلا تھا وہ خود خدا تھا جسے وہ "اعظم العظمیٰ" کہتے ہیں - یہ تخیل ہندوؤں کے برہما سے کتنا ملتا ہے -

امازولو بھی اپنے خدا کا ایک نرکل کی کونپل یا سرکنڈے کی کیاری سے پیدا ہونا بتلاتے ہیں اور یہ تخیل کہ پہلا مرد اور پہلی عورت ایک نرکل سے پیدا ہوئے تھے نہایت ہی عام ہے - فلیپائن کی ایک روایت کے مطابق تخلیق عالم کے وقت پانی میں ایک بید تیر رہا تھا یہاں تک کہ وہ ایک شکرے کے پیر سے آکر ٹکرایا اور جب شکرے نے اُس پر چونچ ماری تو اُس کے ایک جوڑ سے ایک مرد نکلا اور دوسرے جوڑ سے ایک عورت جن کی باتھومیکاپل دیوتا کی اجازت سے شادی ہوگئی اور دُنیا کی ساری قومیں اُنھیں سے پیدا ہوئیں -

میرے خیال میں ان تمام روائتوں میں نرکل، سرکنڈے یا بید سے مراد زمین کا محور ہے اور چونکہ انسان کا نرکل سے پیدا ہونا ظاہر کیا جاتا ہے اور نرکل سے مراد زمین کا محور ہے ——— اور محور ٹھیک قطب شمالی پر ہے اس لئے ان روایتوں کا مطلب یہ ہوا کہ انسان سب سے پہلے قطب شمالی پر پیدا ہوا -

اس کے بعد ہم وشنو بھگوان کے متعلق کچھ عرض کریں گے - میرے خیال میں وشنو جی بحر آرکٹک کے Personification تھے - چنانچہ ان کا تعلق ہمیشہ پانی سے رہتا ہے - اُن کا ایک نام نارائن یعنی "پانی پر تیرنے والا" ہے (نارائن کا مادہ نارا ہے جسکے معنی پانی کے ہیں) کہا جاتا ہے کہ وہ چھیر ساگر میں رہتے ہیں (دودھ کا سمندر، چھیر وہی لفظ ہے جو فارسی میں "شیر" ہے) اور میری فہم میں چھیر ساگر سے جاڑوں کا بحر آرکٹک مراد ہے جب اُس کا پانی جم کر برف بننے لگتے تھا اور دودھ کی طرح سفید نظر آتا تھا اُن کے تین اوتار جن میں انھوں نے مچھلی (متسیہ اوتار) کچھوے (کشیپ اوتار) اور سور (واراہ اوتار) کی شکل اختیار کی تھی پانی سے متعلق ہیں پس ان تمام وجوہات کی بنا پر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ وشنو بھگوان بحر آرکٹک کی تشخیص تھے اور انکی ناف سے اُگنے والا کنول زمین کا (دخانی محور) اور چونکہ محور کے ٹھیک اوپر قطب ستارہ تھا اس لئے برہما جی (جسیں کنول پر بیٹھے دکھایا جاتا ہے) سے مراد قطب ستارہ ہونا چاہئے - پس اس طرح معلوم ہوا کہ ہندوؤں کا برحما اور جاپان کا "آسمان کے محترم مرکز کا مالک دیوتا" ایک ہی ہیں اور آسمان کا یہ مرکزی دیوتا یقیناً نارک نرکل کے اوپر رہا ہوگا

پھر جاپانی تکوینی نظرئے میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ازاناگی نے اپنے نیزے کو سمندر میں ڈال کر کول گول گھمایا اور اُس کے سرے سے جو قطرے ٹپکے وہ جم کر ایک جزیرہ بن گئے - یہ بھی "دخانی محور" کی ایک صورت ہے (یعنی وہ دھواں جو قطبی جزیرے کے نمودار ہونے سے پہلے بحر آرکٹک کے مرکز میں اُٹھتے ہوئے دیکھا گیا ہوگا چنانچہ ہمیں بتلایا جاتا ہے کہ ازاناگی نے جس سبزے کو سمندر میں ڈال کر ہلایا تھا اور جسے اُس نے پانی سے نمودار ہونے والے جزیرے کے وسط میں گاڑا تھا وہ زمین کا محور ہے گیا جو گول گول گھمانے کی بنا پر گردش کرتا ہے -

مذکورہ تکوینی نظریے کا جاپان قطب شمالی پر تھا اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اُس کا دنیا کی چوٹی پر ہونا ظاہر کیا جاتا ہے اور اُسے دنیا کا مرکز بتایا جاتا ہے۔ دنیا یا زمین کا مرکز وہی ہو سکتا ہے (پرانے عقیدے کے مطابق) جو آسمان کے مرکز کے نیچے ہو اور آسمان کا مرکز قطب ستارہ ہے اس لئے جاپان کو ٹھیک قطب ستارے کے نیچے یعنی قطب شمالی پر ہونا چاہئے چنانچہ مجھ سے پہلے بعض حضرات نے اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا مثلاً ڈاکٹر وارین نے اپنی کتاب میں سر ایڈورڈ ریڈ کے اس قول کو نقل کیا ہے کہ "یہ جزیرہ یقیناً زمین کے قطب پر واقع رہا ہوگا" اور یہی رائے مسٹر گرفس کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ: "منجمد قطروں کا جزیرہ پہلے قطب شمالی پر واقع تھا لیکن بعد میں اپنی موجودہ جائے وقوع پر داخلی سمندر میں آگیا"، وہ یہاں پر ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ غالباً وہ یہ سمجھتے تھے کہ پہلے جاپان قطب شمالی پر یعنی بحر آرکٹک میں تھا اور وہاں سے ہٹ کر موجودہ جگہ پر آگیا۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ پہلے جاپانی لوگ قطبی جزیرے میں آباد تھے (جو اب غرق آب ہے) اور وہاں سے ہجرت کرکے جاپان میں آکر آباد ہوگئے اور پیدائش عالم کی وہ روایت جو قطبی جزیرے سے متعلق تھی جاپان سے وابستہ کر دی گئی۔

یہاں پر میں اس بات پر اظہارِ تعجب کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ڈاکٹر وارین نے سر ایڈورڈ ریڈ اور گرفس کے مندرجۂ بالا اقوال نقل کئے اور پھر بھی اُنھیں اس بات کا احساس نہ ہوا کہ جس زمانہ میں انسان قطب شمالی پر آباد تھا وہاں پر یکسر زمین نہ تھی بلکہ ایک جزیرہ تھا اور اُس میں وہ لوگ آباد تھے۔ ڈاکٹر وارین یہ سمجھتے تھے کہ جس زمانہ میں انسان قطب شمالی پر آباد تھا بحر آرکٹک کا وجود نہ تھا یکسر زمین تھی۔

آخر میں میں ناظرین کی توجہ ہندوؤں کی سمندر منتھن والی روایت کی طرف مبذول کروں گا کیونکہ یہ روایت جاپانیوں کے تکوینی نظریے سے کسی حد تک ملتی جلتی ہے۔ ازاناگی نے اپنے نیزہ کو سمندر میں ڈال کر خوب گھمایا اور جب اُسے باہر نکالا تو اُسکے سرے سے جو قطرے ٹپک کر جم گئے وہ بالکل اسی طرح مہابھارت اور بعض پُرانو میں یہ بتایا گیا ہے کہ دیوتاؤں اور راکششوں نے مندراچل (پہاڑ) کو سمندر میں بطور متھانی کے ڈالا اور اُس میں واسوکی سانپ کو رسّی کی جگہ لپیٹ کر خوب متھا۔ اس سمندر کے متھنے سے چودہ رتن برآمد ہوئے۔

اس نہیں جانتا کہ اس روایت کے متعلق اہلِ ہنود کا کیا عقیدہ ہے لیکن میرا عرصہ سے خیال تھا کہ یہ روایت کسی زبردست طبقات الارض حادثہ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اب اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ یہ روایت قطبی جزیرے کی پیدائش یا غرقابی سے متعلق ہے۔ مندراچل سے مراد قطبی جزیرے کا وسطی پہاڑ ہے اور واسوکی سانپ سے ستاروں کا وہ مجموعہ جسے "اژدہا" کہتے ہیں (Draco C. Stellatum) جو ٹھیک قطبی پہاڑ کے اوپر رہا ہوگا۔ پس اس طرح معلوم ہوا کہ یہ واقعہ ایک ایسے زمانہ کا ہے جب قطب ستارہ "اژدہے" کے مجموعہ میں تھا اور مجھے امید ہے کہ میں جلد ہی اس کا صحیح زمانہ متعین کرسکوں گا۔

اس کے بعد ہم مندراچل پر غور کریں گے۔ میرے خیال میں پُرانی روایات میں مندراچل کی جگہ پر میرو پہاڑ رہا ہوگا (اور یا پھر دونوں ایک ہیں) کیونکہ میرو کا ٹھیک قطب پر ہونا ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس امر کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مندراچل کی جو تصویر بنائی جاتی ہے (ملاحظہ ہو شکل نمبر ۴) وہ میرو پربت سے مشابہ ہے۔ میرو پربت کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ اُس کی چوڑائی جتنی نیچے ہے اُس کی دُگنی اوپر ہے۔ اُسے کنول کے پھول کی بیج دانی سے استعارہ کیا جاتا ہے اور کبھی اُسے دھتورے کے پھول اور کبھی کلہڑ سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ ان سب کا مطلب یہ ہوا کہ وہ نیچے کم چوڑا ہے اور اوپر زیادہ پھر ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ میرو پربت کی چوٹی کے اسطہ میں برہما جی کی پُری (شہر) ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ برہما قطب ستارہ ہیں کیونکہ میرو ٹھیک قطب ستارے کے نیچے تھا اور سمندر منتھن والی نظر پر یہ وشنو بھگوان

کو مندراچل پر بیٹھے دکھایا جاتا ہے۔ یہ تخیل ایسا ہی ہے جیسے برہماجی میرو پر براجمان ہوں۔

سمندر منتھن والی روایت میں ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ جس وقت مندراچل کو سمندر میں ڈالا گیا تو اُسے سنبھالنے کے لئے وشنو بھگوان نے کچھوے کی شکل اختیار کرلی۔ اسی لئے مندراچل کو کچھو۔ کی پشت پر قایم دکھایا جاتا ہے (اور اسی بناء پر یہ واقعہ کورم یا کشیپ اوتار کہلاتا ہے) اس تخیل کا مقابلہ جاپانیوں کے اُس عقیدے سے کیا جاسکتا ہے جس کی طرف علامہ نیاز نے یوں اشارہ کیا ہے "جاپانیوں میں کچھوے کی پشت پر دیوتاؤں کا مسکن بتایا جاتا ہے جس کا مرکز ایک پہاڑ ہے"۔ (ترغیبات جنسی صفحہ ۸۵) اصل میں یہ بیان یوں ہونا چاہئے، جاپانیوں میں دیوتاؤں کا مسکن ایک پہاڑ بتایا جاتا ہے جو کچھوے کی پشت پر قایم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں پر کچھوے سے مراد خود زمین ہے اور یہ قطبی جزیرے کی ایک رمزیہ تصویر ہے۔ چونکہ اُس کے چاروں طرف پانی تھا اور اُس کے بیچ کا حصہ کچھوے کی پشت کی طرح اُبھرا ہوا تھا اس لئے اُسے کچھوے سے استعارہ کرتے تھے اور اُس کے بیچ میں جو پہاڑ تھا اُسے دیوتاؤں کا مسکن مانا جاتا تھا۔ یہی پہاڑ ہندوؤں کا میرو، بابل والوں کا اِم کھرساک اور یونانیوں کا اولمپس تھا جو بالترتیب برہما، انو اور زیس سے منسوب تھا اور یہ تینوں محض قطب ستارہ تھے۔

پولی نیشیا کا تکوینی نظریہ

پیدایشِ عالم کے متعلق مذاہبِ عالم نے جو نظرئے پیش کئے ہیں اُنھیں کئی صنفوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے نزدیک پہلی قسم وہ ہے جس میں زمین کو کوئی دیوتا انسان کی صورت میں پانی سے باہر نکالتا ہے جس کی ایک مثال جاپان کا تکوینی نظریہ ہے اور دوسری مثال پولی نیشیا میں نظر آتی ہے نیوزیلینڈ میں زمین برآمد کرنے والے دیوتا کا نام ماؤئی ہے۔ اُس نے زمین کو پانی سے اس طرح نکالا جیسے کوئی مچھلی پکڑتا ہے۔ کہتے ہیں جب اُس نے اپنے مچھلی پکڑنے والے کانٹے کو سمندر میں ڈالا تو زمین اُس میں پھنس گئی اور جب وہ باہر نکل آئی تو وہ اس مچھلی کو اپنے بھائیوں کے حوالے کرکے ایک پروہت کو بلانے چلا گیا تاکہ وہ ضروری رسمیں ادا کرے اور طہارت کی دعائیں پڑھے[1]۔

بھائیوں نے اُس کے جانے کے بعد مچھلی کو کاٹنا شروع کردیا اور وہ اُچھلنے کودنے لگی۔ اس کاٹنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین پر پہاڑ اور وادیاں بن گئیں ورنہ وہ ایک ہموار میدان ہوتی۔

اس واقعہ کی یادگار میں نیوزیلینڈ کے اصلی باشندے (ماوری) اُس کے شمالی جزیرے کو "ماؤئی کی مچھلی" اور جنوبی سرے کو "ماؤئی کا مچھلی پکڑنے کا کانٹا" کہتے ہیں۔

یہی روایت قدرے اختلاف کے ساتھ ٹونگا، ساموآ، ہوائی اور ہروے کے جزیروں میں پائی جاتی ہے جہاں پر زمین نکالنے والے دیوتا کا نام ٹانگاروا (یا ٹانگالوا) ہے لیکن اُس کی بنسی کا ڈورا ٹوٹ جاتا ہے اور زمین دوبارہ ڈوب جاتی ہے۔ صرف اُس کا کچھ حصہ جزیروں کی صورت میں پانی کے اوپر رہ جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ روایتیں کسی جزیرے کے پانی سے نمودار ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اگرچہ پولی نیشیا کے بہت سے جزیروں کی پیدایش کا ایک ہی طریقہ بتایا جاتا ہے یعنی کوئی دیوتا اپنے مچھلی پکڑنے والے کانٹے سے زمین کو پانی کے اندر سے باہر نکالتا ہے لیکن میرے خیال میں یہ روایتیں مقامی نہیں ہوسکتیں بلکہ ان سب کا ماخذ ایک ہے اور وہ پولی نیشیا کا کوئی جزیرہ

---

[1] یہاں پر اس روایت کا گڑھنے والا یہ بھول جاتا ہے کہ زمین کے نمودار ہونے سے پہلے وہ پروہت رہتا کہاں تھا، دوسرے یہ کہ ماؤئی کا مرتبہ ایک پروہت کے برابر بھی نہ تھا ورنہ وہ اُسے بلانے کیوں جاتا۔

نہیں بلکہ قطبی جزیرہ ہے کیونکہ یہ تخیل کہ شروع میں پانی ہی پانی تھا اور پانی سے زمین کو باہر نکالا گیا نہ صرف پولی نیشیا بلکہ دنیا کے اور حصوں میں بھی پایا جاتا ہے ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ زمین کو باہر نکالنے کی جو صورت پولی نیشیا میں بتائی جاتی ہے وہ بالکل اچھوتی ہے۔ زمین کو ایک مچھلی سے استعارہ کیا گیا ہے اور پھر اسے اس طرح باہر نکالا جاتا ہے جیسے کوئی مچھلی کا شکار کھیل رہا ہو اور جب وہ باہر نکل آتی ہے تو اسے پاک کرنے کی بات بتائی جاتی ہے اور اس کارِ عظیم کی انجام دہی کی خوشی میں بعض مذہبی رسوم ادا کرنے کے لئے اس تکونی ڈرامہ کا ہیرو کسی پروہت کو بلانے جاتا ہے لیکن اس کی غیر موجودگی میں اس کے بھائی اس مچھلی کو کاٹنا شروع کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے زمین پر پہاڑیاں اور وادیاں بن جاتی ہیں ورنہ وہ ہموار میدان ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں ضمنی اور فرضی ہیں لیکن عوام کا ان پر عقیدہ ہے اور ٹونگا کے باشندے ہوا گا نامی مقام پر ایک چٹان دکھاتے ہیں جس میں تقریباً دو فیٹ قطر کا ایک وار پار سوراخ ہے اور کہتے ہیں اسی میں ماؤئی کا مچھلی پکڑنے کا کانٹا پھنسا تھا۔ مزید برایں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ کانٹا وہاں کے بادشاہ (ٹوئی ٹونگا؟) کے پاس ۱۸۷۰ء تک موجود تھا۔ علاوہ ازیں ہونولولو کے سرکاری عجائب خانہ میں ایک مچھلی پکڑنے کا کانٹا رکھا ہے جو "ماؤئی کا کانٹا" بتایا جاتا ہے

(باقی)

محمد اسحاق صدیقی

شکل نمبر ۱

شکل نمبر ۲

شکل نمبر ۳

مصر کا ہورس دیوتا جس کا کنول پر کنڈے
سے پیدا ہونا ظاہر کیا جاتا ہے

شکل نمبر ۴

"سمندر منتھن"

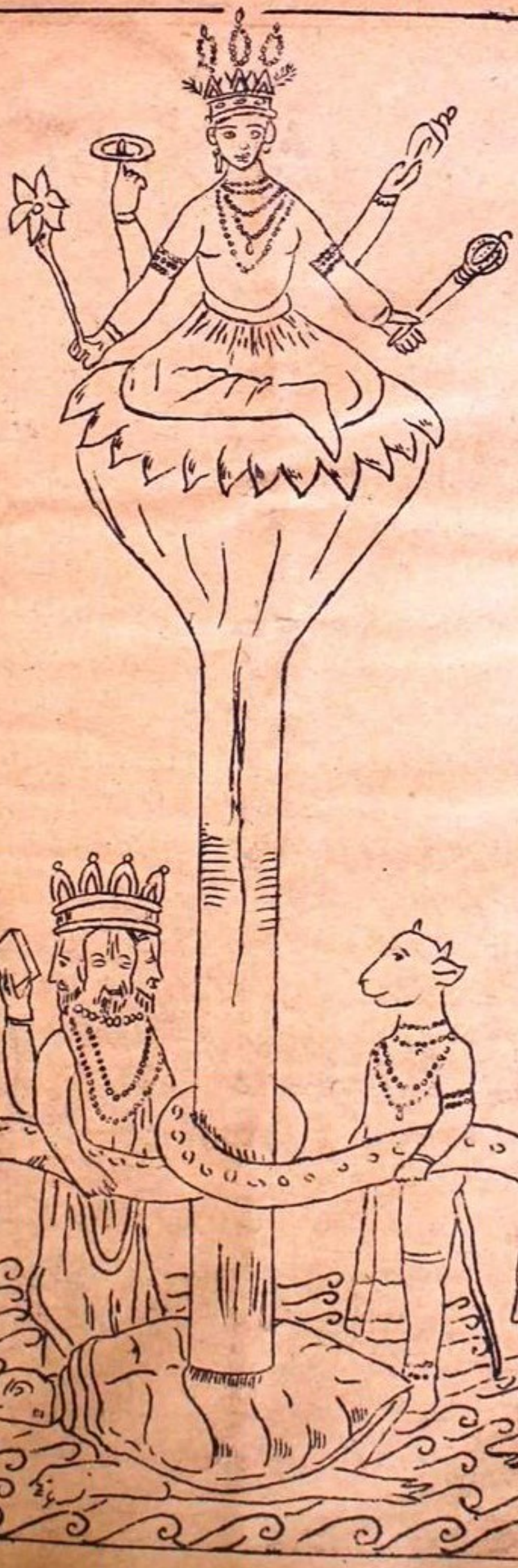

آوارہ گرد اشعار

(۴)

(۱) آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہو گئے خاک انتہا ہے یہ

یہ شعر بلا اختلاف میرؔ کا ہے اور بہت مشہور شعر ہے مگر حیرت ہے کہ یہی شعر بجنسہٖ جذبات اکبر یعنی کلیات دوم شاہ اکبر داناپوری شاگرد وحیدؔ کے صفحہ ۳۰۳ پر مندرج ہے چونکہ یہ دیوان حضرت اکبرؔ کے وصال کے بعد شایع ہوا اس لئے مرتب کی غلطی سے دیوان میں شامل ہوگیا۔ کبھی کبھی ہوتا یہ ہے کہ شاعر اپنے سفینہ میں کچھ پسندیدہ اشعار اساتذہ کے بھی لکھتا رہتا ہے، اور غلطی سے اسی کے نام منسوب ہو جاتا ہے۔

(۲) دل ولیؔ کا لے لیا ولیؔ نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

عام طور پر یہ شعر ولیؔ کا سمجھا جاتا ہے۔ آزادؔ نے بھی یہی لکھا ہے مگر یہ شعر ان کے متداول دیوان میں نہیں پایا جاتا، صاحب گلشنِ گفتار اور چمنستان شعرا نے خفیف تغیر کے ساتھ مضمونؔ سے منسوب کیا ہے اور اس طرح سے

اس گدا کا دل لیا ولیؔ نے چھین ۔ جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

زبان کہہ رہی ہے کہ یہ شعر مضمونؔ کا نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ولیؔ ہی کا ہو۔

(۳) مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے آجاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

"ہماری شاعری" کے مصنف پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ازراہ نوازش اس شعر کو شادؔ لکھنوی سے منسوب کیا ہے اور کسی کو نہیں تو کم از کم پروفیسر صاحب کو تو اس کی پرکھ ہونی چاہئے تھی کہ لکھنوی شعرا عموماً اور شادؔ لکھنوی خصوصاً جو اپنے کو "ہمسرِ میر" کہتے ہیں اور شاید میرؔ کے رنگ کا ایک شعر بھی نہ کہا ہوگا، اس رنگ کے اشعار کہنے سے قاصر ہیں۔ یہ شعر شادؔ عظیم آبادی کا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ "ہماری شاعری" کے آیندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح ہو جائے گی۔

(۴) ترانہ تکمۂ لعل است در لباسِ حریر شد است قطرۂ خوں نیست گریباں گیر

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ یہ شعر نورجہاں کا ہے لیکن حقیقت میں یہ شعر ہے بنائی ہروی کا جس کا انتقال ۹۲۸ھ میں ہوا۔

(۵) برقع برخ افگندہ بردناز بہ باغش تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش

کہا جاتا ہے کہ یہ شعر ناصر علی نے زیب النسا کو مخاطب کر کے کہا تھا حالانکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شعر میر صیدیؔ طہرانی کا ہے اور اس شعر کا تعلق جہاں آرا سے ہے۔ صیدیؔ کا یہ شعر ہو تو ہو مگر جہاں آرا سے اس کو متعلق کرنا حد درجہ سادہ لوحی ہے۔

(۶) لودھ پٹھکری مردہ سنگ ہلدی زیرا اک اک تنگ
انیون چنا بھر مرچیں چار اُرد برابر موسٹا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے نینا پیرا ہل میں ہرے

آبِ حیات میں یہ شعر خسروؔ سے منسوب کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے نقوش سلیمانی میں مخدومؔ بہاری سے منسوب کیا ہے

یہ امر واقع ہے کہ یہ نسخہ اور مخدوم بہاری کے دوسرے چٹکلے صوبۂ بہار میں زبان زد ہیں اور اکثر لوگوں کی بیاض میں بھی مندرج ہیں۔ خسرو سے اس کی نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ حضرت مخدوم بہاری بیعت کے سلسلہ میں دہلی بھی تشریف لے گئے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا سے ملے بھی تھے۔ ممکن ہے خسرو سے بھی ملاقات ہوئی ہو۔ تبادلۂ خیال ہوا ہو۔ اور حضرت مخدوم نے اپنے کچھ نقوش وہاں بھی چھوڑے ہوں اور زبان زد ہوگئے ہوں اور بعد میں خسرو سے منسوب ہوگئے ہوں۔

(۷) لگ جا گلے سے تاب اب لے نازنیں نہیں ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

اثر لکھنوی نے بغیر چھان بین کئے اپنی تصنیف "پٹھان بین" میں اس شعر کو انشا سے منسوب کرتے ہوئے لکھنؤ کے سب پہلوانانِ سخن کو خم ٹھونک کر ایک ہی میدان میں لا کھڑا کیا ہے اور غزلگوئی کے حمام میں سب کو ننگا دکھلایا ہے اسی ضمن میں یہ لکھا ہے کہ انشا نے کنکار کر کہا کہ ؎ لگ جا گلے سے ۔۔۔۔۔۔

اور جرأت نے ہانک لگائی کہ ؎ چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

ساری عمارت کی بنیاد منہدم ہوجاتی ہے جبکہ یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ متذکرہ بالا شعر انشا کا نہیں جس کو وہ کھنکار کر کہتے ہیں بلکہ جرأت ہی کا ہے۔ انشا کو یہ جرأت ہوتی کہ وہ کھنکار کر یہ شعر پڑھتے۔ انشا کے مطبوعہ نسخوں میں یہ شعر نہیں ملتا لیکن کلیات جرأت کے قلمی نسخے میں موجود ہے۔

(۸) یارو خدا ایک ہے دوسرا برحق نبی صورت لوح و قلم جس کے لئے خلق کی

مثنوی بوم و بقال کا یہ پہلا شعر ہے جو سودا کے یہاں فدوی لاہوری کے ہجو میں پایا جاتا ہے۔ میر حسن کے خیال کے مطابق یہ مثنوی سودا کی نہیں بلکہ ان کے شاگرد فتح علی شیدا کی ہے۔ کریم الدین نے بھی فتح علی ہی کی تصنیف بتایا ہے اور سودا کے دیوان میں شایع ہوجانے پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ ان کے قول کے مطابق اس مثنوی میں شیدا نے اپنے استاد سودا کا ذکر بھی اس طرح کیا ہے ؎

دارد احمد نگر ایک ہیں مردِ عزیز، فہم ہے سرتاقدم اور سراپا تمیز
شعر یہ ہر ایک کے کرتے ہیں وہ اعتراض جامی کے دیوان سے خوب جانیں ہیں اپنی بیاض
حضرت سودا تلک جو مرے استاد ہیں، شعر پہ ان کے بھی اب ان کے یہ ایراد ہیں

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مثنوی شیدا ہی کی ہے۔ مگر دیوان سودا کے متداول نسخوں میں یہ مثنوی موجود ہے جس کا تیسرا شعر اس طرح ہے ؎

سب پہ کرے ہے طعن جتنے کہ استاد ہیں شعر پہ میرے بھی اب ان کے یہ ایراد ہیں

تعجب ہے کہ مثنوی کے آخر میں سودا کا تخلص بھی موجود ہے ؎

بس چل اب آگے نہ کہ کچھ انھیں سودا خموش گیجئے اس سے سخن ہووے جسے عقل و ہوش

(۹) سودا کے متداول دیوان میں ایک قصیدہ مصحفی کی ہجو میں ہے جس کی ابتدا ہے:-

کیا حضرت سودا نے کی اے مصحفی تقصیر کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر صفحہ میں تحریر

دیباچہ میں لکھا ہے کہ سودا کے ایک شاگرد کی تصنیف ہے۔ بعض تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی حکیم اصلح الدین نامی تھے جو سودا کے شاگرد تھے وہی اس ہجو کے مصنف ہیں۔ میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ تصنیف خود سودا کی ہے۔ بعض مصلحت وقت کی بنا پر سودا نے براہ راست مصحفی کو منھ لگانا پسند نہ کیا اس لئے کسی شاگرد کی آڑ لینا پڑی۔ زور بیان صاف غمازی کر رہا ہے کہ سودا کے قلم کی تراوش ہے۔ غالباً یہی حال مثنوی بوم و بقال کا بھی ہو۔

(۱۰) سودا کے متداول دیوان میں دو مثنویاں شدت سرد گرما کے عنوان سے ملتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق کی تحقیق کے مطابق دونوں قایم کی تصنیف ہیں۔ اثر رام پوری نے معارف اپریل ۵۲ء میں قایم پر ایک مضمون لکھتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ نسخۂ رام پور میں

صرف ہجو شدت سرما ہے، گرما نہیں - ممکن ہے اور نسخوں میں ہو۔ مثنوی در ہجو شدت سرما کا پہلا شعر یہ ہے :-

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید صبح نکلے ہے کانپتا خورشید (۵۶) اشعار

تعجب ہے کہ اس میں سودا کا تخلص بھی موجود ہے ؎

سودا آخر ہے سردی کا مذکور شعر بھی گرخنک ہوں رکھ معذور

اثر رام پوری فرماتے ہیں کہ ان کے نسخہ میں قایم کا تخلص ہے -

(۱۱) سودا کے متداول دیوان میں چند منظوم حکایتیں ملتی ہیں جن کے پہلے مصرعے حسب ذیل ہیں ؎

۱- سنا ہے کہ اک مرد اہلِ طریق ..... ۱۱ اشعار

۲- سلف کے زمانے کا تاریخ داں ..... ۲۳ اشعار

۳- سُنا ہے کہ اک مرد آزادہ طور ..... ۱۶ اشعار

۴- سُنا جائے ہے اک مہوس کا حال ..... ۱۲ اشعار

یہ چاروں حکایتیں قایم سے بھی منسوب ہیں اور بقول اثر رام پوری، کتب خانہ رام پور کے نسخہ میں موجود ہیں -

(۱۲) حکایت "مرد درویش پنجاب" ایک طویل مثنوی ہے جو سودا کے دیوان میں موجود ہے اور ۳۶۰ اشعار کو محیط ہے اور جس کا پہلا مصرع ہے ؎ "الٰہی شعلہ زن کر آتشِ دل"

یہ پوری مثنوی قایم کے دیوان میں بھی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ سودا کا تخلص بھی موجود ہے ؎

بس لے سودا خموشی پیشہ کر تو سخن کے طول سے اندیشہ کر تو

ڈاکٹر عبدالحی کا خیال ہے کہ حقیقت میں یہ مثنوی قایم کی ہے۔

(۱۳) سودا کے دیوان میں ایک مثنوی چھڑی کی تعریف میں ہے جس کی ابتدا ہے ؎

ہوتی ہے دُنیا میں جو کچھ تحفہ چیز سب سے ہے سودا کو یہ لاٹھی عزیز

میر حسن نے اس مثنوی کو ممتاز سے منسوب کیا ہے، دوسرا مصرعہ یوں ہے ؎

سب سے ہے ممتاز کو لاٹھی عزیز

اس مثنوی کے آخر میں سودا کا تخلص بھی آیا ہے ؎

چپ رہ اے سودا نہ ہو برخود غلط

بس ہے ترے حق میں یہ نکتہ فقط

یہاں سودا کی جگہ ممتاز کا تخلص نظم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اس کا امکان ہے کہ سودا ہی کی مثنوی ہو۔

سودا کے دیوان میں جب اتنا کلام مشتبہ ہو تو اس میں رہ کیا جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان کے متداول دیوان میں جو مراثی کا مجموعہ ہے اس میں اکثر حصہ ان کے ایک مہربان دوست، مہربان خاں کا ہے۔ مہربان خاں کا تخلص رند تھا مگر مرثیہ میں از راہِ احتیاط تقدس مہربان تخلص کرتے تھے، بعض لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سودا اپنے مرثیوں میں مہربان تخلص لاتے تھے جو حقیقت کے خلاف ہے - بہتیرے مراثی میں تخلص سودا موجود ہے - دوسرے یہ کہ ایک آدھ مرثیہ میں نہ صرف مہربان بلکہ مہربان خاں نظم ہوا ہے جس کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔

(پروفیسر) عطاء الرحمٰن - کاکوی

ایک ہزار سال قبل کا ہندوستان

(بزرگ بن شہریار مشہور جہازران کے قلم سے)

"بزرگ بن شہریار" ایک پارسی نومسلم تھا اور اپنے وقت کا مشہور سیاح و جہازران تھا۔ یہ رام ہرمز کا رہنے والا تھا اور بہ سلسلۂ تجارت ہندوستان، برہما اور چین وغیرہ کے ساحلوں پر اس کی آمد و رفت بہ کثرت رہتی تھی۔ اس نے اپنے حالات سیاحت کی ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام "عجائب الہند" ہے۔ یہ کتاب روس میں چھپی تھی اور اس کی ایک کاپی کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں موجود تھی۔ اسی کتاب کے بعض اقتباسات مولانا شرر مرحوم نے اپنی رائے کے ساتھ شایع کئے تھے کہ:-

"اس کتاب میں مشاہدات کے علاوہ بہت سی سماعی باتیں بھی شامل ہیں جس کی وجہ سے کتاب کی شان سندباد جہازی کے سفر کی سی ہوگئی ہے، لیکن انھیں سماعی باتوں میں بعض واقعات ایسے بھی ملتے ہیں جن سے اس زمانہ کے ہندوستان کا ایک بہت اچھا خاکہ نظر کے سامنے آجاتا ہے"۔

ان میں بعض واقعات واقعی بہت دلچسپ ہیں جو آج کی اشاعت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

بزرگ بن شہریار لکھتا ہے:-

مجھ سے ابو محمد حسن بن عمرو نے جو ۸۸۳ھ میں (سندھ کے اسلامی دارالسلطنت منصورہ میں تھا) بصرے میں بیان کیا کہ کشمیر اعلیٰ اور کشمیر اسفل کے درمیان ایک قلمرو ہے جس کا راجہ "را" (رائے) کے لقب سے مشہور ہے۔ اُس کا ذاتی اور اصلی نام "مہروک" ہے اور اُس کے باپ کا نام "راق" تھا۔ اُس نے ۲۷۰ھ میں حاکم منصورہ عبداللہ بن عمرو بن عبدالعزیز کے پاس کہلا بھیجا کہ میرے دربار میں کسی ایسے شخص کو بھیجئے جو ہندوستان کی زبان میں مجھے شریعت اسلامیہ کے مسایل بتا سکے۔ اتفاقاً منصورہ ہی میں ایک عراقی النسل ہندی نژاد موجود تھا جو ہندوستان کی مختلف زبانوں میں درخور رکھتا تھا۔ اسی قدر نہیں بلکہ وہ عربی اور ہندی زبانوں کا شاعر بھی تھا۔ امیر عبداللہ نے اُس کو دربار میں بلایا اور راجہ کی خواہش اُس پر ظاہر کردی۔ اس حکم کی تعمیل میں اُس نے سندھی زبان میں ایک قصیدہ کہا جس میں تمام عقاید اسلامیہ بوضاحت بتادئے۔ امیر عبداللہ نے اُس قصیدہ کو بہت پسند کیا اور اُسے راجہ کے پاس بھیجدیا۔ جب یہ قصیدہ اُس راجہ کے دربار میں پیش ہوا اور اُسے پڑھ کے سنایا گیا تو اس نے شاعری کی قابلیت و قادرالکلامی کی داد دی اور امیر عبداللہ کو لکھا کہ اس شاعر کو میرے دربار میں بھیجدیجئے۔ شاعر اگرچہ منصورہ سے قدم نکالنا نہ پسند کرتا تھا مگر امیر عبداللہ نے اُسے راضی کرکے بھیجا۔ راجہ نے اُس کی بڑی قدر و منزلت کی اور بڑے اصرار سے تین سال تک رکھا اور جب واپس آیا تو امیر عبداللہ نے اُسے اپنے سامنے بلاکے راجہ کے حالات دریافت کئے۔ اُس نے عرض کیا کہ "حضور والا۔ جس وقت میں نے راجہ کے دربار کو چھوڑا ہے اُس وقت میرا یہ خیال تھا کہ اسلام نے اُس کے دل میں پوری جگہ کرلی ہے مگر غالباً سلطنت کے جاتے رہنے کے خوف سے اُس کا اظہار نہیں کرتا"۔

اس شخص کا یہ بھی بیان تھا کہ:- "راجہ نے مجھے قرآن کا ترجمہ کرنے اور آیات قرآنی کی تفسیر و توضیح کرنے کا حکم دیا۔ اُس کے

حکم کے مطابق میں نے ہندی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ شروع کیا۔ ترجمہ لکھتے تھے جب میں سورۂ یٰسین تک پہونچا اور اس آیت کا ترجمہ کیا کہ:۔ "قالَ من یحیی العظام وہی رمیم ۵ قل یحییہا الذی انشاءہا اوّل مرۃ ۵ وہو بکل خلقٍ علیم ۵ (کہا (منکر خدا نے) جب ہڈیاں بوسیدہ ہوچکی ہوں گی تو انھیں پھر کون جلادے گا؟ جواب دو (اے محمد) وہی انھیں پھر جلادیگا جس نے پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر طرح کی پیدائش سے خوب واقف ہے) تو میں نے اُسے ترجمہ سنایا۔ وہ سنتے ہی بے اختیار ہو کے اپنے طلائی مرصع تخت سے اُتر پڑا اور مجھ سے کہا "پھر کہو" میں نے دوبارہ بیان کیا تو وہ آگے بڑھ کے زمین کے اوپر سجدے میں گر پڑا۔ اپنے رخسارے دیر تک زمین پر رگڑتا رہا اور آنسو برابر جاری تھے۔ چونکہ تھوڑی ہی دیر پہلے زمین پر پانی چھڑکا گیا تھا اسلئے جب اُس نے سر اُٹھایا تو پیشانی اور گالوں میں جابجا مٹی بھری ہوئی تھی۔ سجدے سے اُٹھ کے اُس نے چاروں طرف دیکھا اور زبان پر یہ کلمات تھے کہ 'جس یہی معبود ازلی ہے جس کی نہ ابتدا ہے اور نہ جس کے مثل کوئی ہے"۔ اس واقعہ کے بعد راجہ نے ایک گھر بنایا جسمیں اکیلا جا کے بیٹھتا اور نماز پڑھتا ہے اور ظاہر یہ کرتا ہے کہ "وہاں میں اپنے مہماتِ سلطنت پر غور کیا کرتا ہوں"۔

ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے:۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے ایک راجہ نے محمد بن بابر شاہ کی مورت بنوا کے رکھی تھی۔ اسلئے کہ اس شخص کو اُس عہد کے ناخداؤں میں بڑی شہرت حاصل تھی اور سمندر میں اُس کا نام بہت مشہور ہوگیا تھا۔ ہندوستانیوں میں رواج ہے کہ جس شخص میں دانائی و لیاقت کا جوہر ہو یا دنیا میں قدر و منزلت رکھتا ہو چاہے کسی قوم کا شخص ہو اُس کی مورت بنوا کے رکھا کرتے ہیں۔

ایک جگہ لکھتا ہے:۔ حسن بن عمرو نے مجھ سے بیان کیا کہ اُنھوں نے منصورہ میں تشمیر (کشمیر) اسفل کے لوگوں کو دیکھا۔ اُنکا ملک منصورہ سے ستر دن کی مسافت پر ہے۔ وہ کشمیر سے دریائے مہران (اٹک) کے بہاؤ پر آیا کرتے ہیں۔ یہ دریا دجلے اور فرات کی طرح بہتا ہے۔ وہ اپنے ملک سے یہاں بطریق تجارت قسط (یعنی کُٹ) لاتے ہیں۔ لانے کی ترکیب یہ ہے کہ بڑے بڑے ٹوکرے بناتے ہیں پھر اُن ٹوکروں پر چمڑا منڈھ کے اُس پر قیر (۱۱۰) مل دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے پانی بالکل نفوذ نہیں کرسکتا۔ ہر ٹوکرے میں سات آٹھ سو من (من اُس زمانہ میں بہت ہی چھوٹا ہوتا تھا) کُٹ بھری جاتی ہے۔ اس قسم کے بہت سے ٹوکروں کو ایک میں باندھ کے ایک بڑا بیڑا بنا لیتے ہیں اور اُسی پر خود بھی بیٹھ کے سفر کرتے ہیں اس طرح دریائے مہران (اٹک) کے ذریعے سے چالیس دن میں منصورہ تک آپہونچتے ہیں اور قسط ویسی ہی خشک رہتی ہے جس میں بالکل پانی نہیں پہونچتا۔

اسی سلسلہ میں لکھتا ہے:۔ مجھ سے بعض ایسے لوگوں نے جنھوں نے ہندوستان کی سیر کی تھی بیان کیا کہ یہاں ایک ایسے زبردست کاہین (برش جاننے والے مرتاض) موجود ہیں جو صحرا میں کسی برند کو اوپر اُڑتے دیکھ کے ایک دائرہ کھینچ دیتے ہیں جس سے وہ پرند نہیں نکل سکتا اور اُسی کے اندر چکر لگاتے لگاتے آخر اُسی میں آکر گر پڑتا ہے اور وہ بے تکلف پکڑ لیتے ہیں۔ یا فرض کیجئے کہ کوئی چڑیا کہیں بیٹھی نظر آئی تو دور ہی سے اُس کے گرد حلقہ کھینچ دیتے ہیں جس میں سے وہ چڑیا نہیں نکلنے پاتی اور آخر اُسی کے اندر رگید رگید کے پکڑ لیتے ہیں۔

آگے بڑھ کے لکھتا ہے: خراب اور خطرناک سمندروں میں بحر سراندیب ہے۔ جو تین سو فرخ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مگرمچھ بہت کثرت سے ہیں اور سواحل پر اول تو چیتوں کی کثرت ہے دوسری قوم وارج (بوہرہ) آباد ہے۔ یہ لوگ دریا میں لوٹ مار کرتے ہیں۔ اور جہاں کوئی جہاز اُن کے ہاتھ میں پڑ گیا پھر اُس کی خیریت نہیں۔ کیونکہ وہ مردم خوار ہیں اور سب لوگوں کو پکڑ کے کھا جاتے ہیں یہ قوم یہاں کی ساری آبادی میں بدترین قوم ہے اور جہاز والوں کے لئے نہایت خطرناک۔ کیونکہ جہاز اگر سمندر میں ٹوٹا تو مسافروں کو مگرمچھ نگل جاتے ہیں۔ کنارے پر جا کے ٹوٹا اور لوگ جان بچا کے زمین پر گئے تو چیتے پھاڑ ڈالتے ہیں اور اگر کنارے سے بچتا ہوا چلا تو یہی جہازی ڈاکو بوہرے آکے پکڑتے اور ایک ایک کو چُن کے کھا جاتے ہیں۔

ایک یہ عجیب واقعہ بیان کرتا ہے :۔ مجھ سے حسن بن عمرو نے ایک ایسے شخص سے سُن کے بیان کیا جو حالات ہند سے خوب واقف تھا کہ ہندوستان کا ایک بڑا راجہ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور سامنے پنجرے میں ایک طوطا لٹک رہا تھا جو خوب باتیں کرتا تھا۔ راجہ نے کھاتے کھاتے اُس سے کہا " آؤ میرے ساتھ کھاؤ"۔ طوطا بولا " بلّی سے ڈرتا ہوں کیسے آؤں ؟" اس لئے کہ وہاں بلّی پاس ہی موجود تھی۔ طوطے کے اس جواب پر بے اختیار راجہ کی زبان سے نکل گیا " بلا وجرک"۔

یہ ہندی الفاظ ہیں۔ یعنی یہ کہ "تیری بلا میں اپنے سر لوں گا"۔ ہندوستان میں یہ ایک بلا کا فقرہ تھا۔ معمول تھا کہ اکثر معززین اور صاحبِ رتبہ لوگ راجہ کے پاس آکے کہتے " بلا وجرک" " بلا وجرک" یعنی ہم آپ کے فدائی و جانثار بنتے ہیں۔ راجہ اُن کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی اُنھیں اپنے ہاتھ سے چاول کھلاتا۔ پھر اُنھیں اپنے ہاتھ سے تانبول (پان) دیتا اور وہ لوگ فوراً اپنی چھنگلیا کاٹ کے اُس کے سامنے رکھ دیتے۔ اس رسم کے ادا ہوتے ہی وہ لوگ سائے کی طرح راجہ کے ساتھ ساتھ رہتے۔ جہاں جاتا جاتے۔ جہاں ٹھہرتا ٹھہرتے۔ جو کھاتا کھاتے۔ جو پیتا پیتے۔ اور راجہ کے کھانے پینے اور تمام امور کے متکفل رہتے۔ یہانتک کہ راجہ کے پاس خلوت میں کوئی رانی معشوقہ یا لونڈی بھی جاتی تو اُس کی تلاشی لے لیا کرتے۔ اس کے بچھونے کو خود ہی بچھاتے۔ راجہ کے لئے اگر کوئی شخص کھانے پینے کی چیز لاتا تو اُسے لیکے پہلے خود چکھتے پھر راجہ تک پہونچنے دیتے۔ اس کے بعد اگر کبھی یہ راجہ بیمار پڑتا تو اپنے جسم کو اذیت دے دے کے خود کو بھی بیمار ڈال دیتے۔ اگر اُس نے اپنے آپ کو کسی سبب سے زندہ جلا ڈالا تو خود بھی جل مرتے اور جب مرتا تو سب کے سب خودکشی کر لیتے۔ راجہ جب میدانِ جنگ میں جاتا تو اُسے اپنے حلقے میں لئے رہتے۔ اور چونکہ یہ نہایت شریفانہ خدمت تھی لہذا سوا عالی خاندان۔ معزز اور شجاع لوگوں کے اور کسی کو فدائی اور جاں نثار بننے کا حق نہیں حاصل تھا چنانچہ راجہ کے ایسے ایسے صاحبِ عہد جاں نثار ہمیشہ معززین قوم اور شرفائے ملک ہی میں سے ہوا کرتے۔

الغرض طوطے نے جیسے ہی راجہ کی زبان سے الفاظ "بلا وجرک" سُنے اور اُس کے ساتھ ہی اُسے چاول کھاتے دیکھا فوراً پنجرے سے نکلا اور اُڑ کے پاس آکے کھانے پر بیٹھ گیا تاکہ ساتھ کھانا کھائے۔ بلّی تاک میں لگی ہوئی تھی۔ آتے ہی اُسے جھپٹ لیا۔ اور اُس کا سر کاٹ کے کھا گئی۔ یہ دیکھتے ہی راجہ گھبرا اُٹھا اور کوئی تدبیر بنائے نہ بنتی تھی۔ آخر اُس نے طوطے کی بے سر لاش کو تھالی میں رکھا۔ اُس پر کافور ڈالا۔ اُس کے گرد الائچیاں، پان، چونا اور ڈلیاں رکھیں پھر اُس تھالی کو خود اپنے ہاتھ میں لے کے اس شان سے شہر اور لشکر گاہ میں چکر لگایا کہ اُس کے آگے آگے نقارہ بجتا جاتا تھا۔ پھر اس کے بعد اُس خالی تھالی کو برابر دو سال تک شہر میں گشت کراتا رہا۔

اس حالت کو جب اتنا زمانہ گزر گیا تو راج کے سارے " بلا وجریہ" فدائی بگڑ کھڑے ہوئے اور کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ معاملے کو اتنے دن ہو گئے۔ آخر آپ کب تک ڈالتے رہیں گے ؟ یا تو اپنا عہد پورا کریں اور یا صاف صاف کہہ دیجئے کہ نہیں ہو سکتا۔ تاکہ ہم آپ کو گدی سے اُتار کے دوسرے کو راجہ بنالیں" آپ جانتے ہیں کہ جو کوئی کسی سے " بلا وجریہ" کہدے اُسے اپنا عہد پورا کرنا واجب ہے اور اگر بد عہدی کرے تو وہ بھنڈ ہو جاتا ہے (اور بھنڈ کے معنی اُن کی زبان میں ذلیل دور فرومایہ میں جیسے گوئیے۔ سازندے۔ یا اسی قسم کے اور ادنیٰ لوگ) یہ تو ایک عہد ہے اور عہد میں راجہ پرجا سب برابر ہیں"۔

آخر راجہ سے کوئی تدبیر نہ بن پڑی۔ اُس نے لکڑیاں۔ صندل اور میٹھا تیل منگوا کے جمع کیا۔ پھر ایک گڑھا کھود کے اُس میں وہ چیزیں ڈال دیں اور آگ لگا دی۔ جب خوب آگ کے شعلے بھڑکنے لگے تو پہلے راجہ دوڑ کے اس میں پھاند پڑا۔ پھر اس راجہ کے جتنے فدائی تھے وہ چھاندے۔ اسی طرح پھر اُنکے جاں نثاروں نے جانیں دیں۔ الغرض اس ایک دن میں تقریباً دو ہزار آدمی آگ میں کود کے جل مرے اور یہ سب صرف اس وجہ سے ہوا کہ دھوکے دھوکے میں راجہ کی زبان سے بلا وجریہ کے خوفناک الفاظ نکل گئے تھے۔

(۲)

سراندیپ جس جزیرے میں عرب کے مسلمان تاجر کثرت سے آباد ہو گئے تھے۔ وہاں کے حالات میں یہ بحری سیاح لکھتا ہے:
اُسی حسن بن عمرو کا یہ بھی بیان ہے کہ سراندیپ (لنکا) کے راجہ اور امرا ہنڈول (اس سے غالباً سکھپال سراد ہے) میں سوار ہو کے نکلتے ہیں۔ جسے لوگ اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوتے ہیں اور وہ تخت (میانے) کے مثل ہوتا ہے۔ ایک غلام سونے کی تھالی ہاتھ میں لئے ہوئے ساتھ رہتا ہے جس میں تانبول (پان) رکھے ہوتے ہیں۔ راجہ کے باہر نکلنے کی شان یہ ہے کہ پان برابر کھاتا رہتا ہے اور اُنھیں چبا چبا کے آگالدان میں تھوکتا رہتا ہے۔ راستے میں اگر کبھی پیشاب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اپنے ہنڈول سے ذرا باہر نکل کے پیشاب کرلیتا ہے اور سکھپال بدستور چلتی رہتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ سڑک ہو یا کوئی تنگ گلی ہو یا بازار ہو پیشاب کے لئے رکتا نہیں اور جہاں پیشاب سے فراغت ہوئی بغیر اسکے کہ دھوئے یا کسی قسم کی طہارت کرے دھوتی برابر کرلیتا ہے۔

اسی سلسلہ میں لکھتا ہے "سندان (ساحل ملیبار کا ایک شہر ہے) میں میں نے ایک ہندی شخص کو دیکھا جو ایک مکان کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اتفاقاً پرنالے سے کچھ پانی گرا اور اُس کے کپڑوں پر پڑ گیا۔ اُس کے پڑتے ہی وہ ٹھہر گیا اور پوچھا "یہ پانی کیسا ہے؟ ہاتھ دھونے یا منہ دھونے کا؟" لوگوں نے کہا "نہیں، یہ ایک لڑکے کا پیشاب تھا۔" یہ سنتے ہی وہ شخص مطمئن ہو کے بولا "تو کچھ مضایقہ نہیں" اور اپنی راہ لی۔ وجہ یہ کہ ان لوگوں کے نزدیک ہاتھ یا منہ کا دھوون نہایت ہی ناپاک تصور کیا جاتا ہے اور پیشاب بمقابل اس کے طاہر۔

اُس کا یہ بھی بیان ہے کہ:۔ برف کے گھلے ہوئے پانی میں جو پہاڑوں اور صحراؤں سے بہتا ہوا آتا ہے۔ یعنی بڑے بڑے دریاؤں میں منہ اور طغیانی کے زمانہ میں ہندو اُن کے پانی میں اُتر کے نہاتے۔ غوطے لگاتے اور اُسی میں پیشاب کرتے ہیں۔ اس کے بعد منہ میں پانی لیتے اور باہر نکل کے زمین پر کلی کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ منہ کا پانی دریا میں پڑ گیا تو دریا کا پانی ناپاک ہو جائے گا۔
اُسی حسن بن عمرو کی روایت سے یہ بھی بتاتا ہے کہ:۔ وہ سراندیپ (لنکا) میں گیا تھا۔ وہاں کے لوگوں سے ملا جلا تھا اور کہتا تھا کہ ساحل پر راجہ کی ایک کروڑ گیری کی چوکی ہے جس میں ہر قسم کے ماں تجارت پر محصول لیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بیان کرتا ہے کہ:۔ بعض سیاحان بحر نے مجھ سے بیان کیا کہ کولم ملّی (جنوبی ہند کا ایک ساحلی شہر) میں ایک سانپ ہوتا ہے جسے "ناغزان" (ناگن) کہتے ہیں۔ اُن کے سر پر نقطے ہوتے ہیں۔ پھن اُٹھاتا ہے تو زمین سے ایک ایک دو دو ہاتھ اونچا ہو جاتا ہے اور کسی کو کاٹتا ہے تو وہ فوراً مر جاتا ہے۔ یہیں کوم ملّی میں ایک مسلمان شخص ہے جو ہندیوں میں "نیجی" کے نام سے مشہور ہے اور وہاں کی مسجد کا امام ہے وہ ایسے سانپ کے کاٹے کو جھاڑتا ہے۔ اگر زہر اثر کر چکا ہو تو کچھ فایدہ نہیں ہوتا۔ تاہم بہت سے لوگ اُس کے جھاڑنے سے اچھے ہو جاتے ہیں۔ ان اطراف میں ہندؤں کی ایک جماعت ہے جو سانپ کے کاٹے کو جھاڑتی ہے۔

اسی سلسلہ میں وہ لکھتا ہے کہ:۔ محمد بن باب شاہ (جس کی سورت ہندوستانیوں نے بنوائی تھی) نے مجھ سے بیان کیا کہ بعض بلاد ہند میں مجھے نظر آیا کہ جس کسی کو سانپ کاٹتا ہے اگر وہ جھاڑنے سے اچھا ہو گیا تو خیر۔ ورنہ لوگ اُسے ایک لکڑی کے تختے پر لٹا کے ندی میں بہا دیتے ہیں۔ اکثر گاؤں چونکہ ندیوں کے کنارے ہی کنارے آباد ہیں اس لئے اس تختے کو دیکھتے ہی لوگ دوڑتے اور اُسے جھاڑتے ہیں۔ کسی کے جھاڑنے سے اگر اچھا ہو گیا تو اپنے پاؤں سے چل کے خود ہی گھر میں چلا آتا ہے اور نہ اچھا ہوا اور کسی کی پڑھنت کارگر نہ ہوئی تو ندی اُسے سمندر میں لیجا کے پھینکدیتی ہے جس میں ڈوب کے مر جاتا ہے۔

اُسی محمد بن باب شاہ کا بیان ہے:۔ جو ندیاں ملک گجرات میں ہیں اُن میں سے ایک جو بہت ہی تیز بہتی ہے اُس کے کنارے کنارے میں ایک مرتبہ گذر رہا تھا۔ اس وقت بھاٹا یعنی جزر تھا اور ندی بہت اُتری ہوئی تھی۔ جاتے جاتے مجھے لب آب ایک بڑھیا نظر آئی جو پانی کے پاس بالو پر پالتھی مارے بیٹھی تھی۔ میں نے پوچھا "یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" بولی "اب میری عمر زیادہ آگئی۔ بہت کچھ

کھا پی چکی۔ اب ضرورت ہے کہ میں اپنے پروردگار کے پاس جاؤں اور دنیا کے عذاب سے چھوٹوں۔" میں نے کہا "تو پھر یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" بولی "اس انتظار میں کہ جوار آئے۔ طغیانی ہو۔ اور پانی کا سیلاب مجھے بہا لیجائے۔" الغرض وہ اسی طرح وہاں بیٹھی رہی، یہاں تک کہ پانی میں طغیانی ہوئی اور موجیں اُسے بہا لے گئیں۔

اسی بارے میں اس کے علاوہ یہ کہتا ہے:۔ "کنبات میں بعض سیاحانِ ہند نے دیکھا کہ لوگ یکے بعد دیگرے وہاں کی خلیج میں ڈوبنے کے لئے آتے ہیں اور لوگوں کو مزدوری دے دے کے کہتے ہیں کہ ہمیں ڈبو دو۔ چونکہ اُن لوگوں کو اندیشہ رہتا ہے کہ شاید خود ہم سے نہ ڈوبا جائے۔ اس لئے لوگوں کو اُجرت دے کے اس کام پر مامور کر دیتے ہیں کہ ہم ہزار بچنا اور جان چھڑانا چاہیں تم ایک نہ سننا اور نہ زبردستی سر پکڑ کے ڈبو دینا۔

اسی سلسلہ میں اُس نے جزیرۂ جاوا کا بھی کچھ حال بیان کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:۔ یونس بن بہران سیرانی جس نے جزیرۂ زابج (یہ عرب سیاح جاوا کو زابج ہی کہتے تھے) کا سفر کیا تھا مجھ سے بیان کرتا تھا کہ وہ وہاں کے اُس بڑے شہر (دارالسلطنت) میں گیا جو جزیرہ کا ہے اس میں بے اندازہ بڑے بڑے بازار ہیں اور کہتا تھا کہ میں نے وہاں کے صرافے کے بازار میں آٹھ سو صراف گنے جو دوکانیں لگائے بیٹھے تھے۔ یہ اُن صرافوں کے ماسوا ہیں جو شہر کے مختلف حصوں اور بازاروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد آگے چل کے لکھتا ہے کہ:۔ صیمور (یہ علاقۂ لیبار کا ایک ساحلی شہر ہے) میں عباس بن ماہان نام ایک شخص رہتا تھا جو اصل میں سیراف کا رہنے والا تھا۔ اور صیمور میں مسلمانوں کا قاضی تھا۔ یہاں سواحل ہند پر جو لوگ مسلمانوں کے سرگروہ اور قاضی مقرر ہوتے ہیں وہ "ہنرمن" کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ شخص بھی "عباس ہنرمن" کہلاتا تھا اور جو مسلمان جہازران یا تاجر یہاں آتے یا آکے اقامت گزیں ہوتے اُن کے فیصلے یہی شخص کرتا۔ کیونکہ مُلک کے راجہ کی طرف سے باضابطہ طور پر یہ اقتدارات اُسے عطا ہوئے تھے۔ اتفاقاً بعض جہازی لوگ یہاں آکے اُترے جن میں ایک نہایت ہی بیہودہ اور شرمناک کیرکٹر کا مسلمان تھا۔ وہ صیمور میں اِدھر اُدھر سیر کو گیا تو ایک مندر نظر آیا جس میں کسی دیوی کی نہایت ہی خوبصورت مورت نصب تھی جس کی ہندو روزانہ پرستش کیا کرتے تھے۔ یہ بدکار مسلمان کسی ایسے وقت اُس بُت خانے میں پہونچا جبکہ کوئی شخص موجود نہ تھا اور سب کی آنکھ بچا کے اُس نے دیوی کی اُس حسین مورت کے ساتھ زنا کیا۔ بعض پجاریوں نے اُس کی اس بیہودگی کو بشرے سے بھانپا پھر جاکر مورت کو دیکھا تو پوری پوری تصدیق ہوگئی۔ فوراً انھوں نے جاکے راجہ کے دربار میں شکایت کی۔ راجہ نے اس مسلمان شخص کو اپنے دربار میں طلب کرکے دریافت کیا تو اُس نے صاف صاف الفاظ میں اپنے جُرم کا اقرار بھی کرلیا۔ اب جُرم کے ثابت ہوجانے کے بعد اُس نے وزراء اور اہلِ دربار سے مشورہ کیا کہ اس گستاخ و بدتمیز مسلمان کو کیا سزا دیجائے؟ کسی نے کہا "اسے مست ہاتھی کے آگے ڈال دیا جائے۔" کسی نے کمال غیظ و غضب سے یہ رائے دی کہ "اس کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کے جدا کی جائیں۔" یہ سب تجویزیں سُن کے راجہ بولا "یہ کچھ نہیں۔ یہ شخص عرب ہے اور ہم سے عرب لوگوں سے معاہدہ ہے۔ بہترین تجویز یہ ہے کہ تم میں سے کوئی شخص مسلمانوں کے ہنرمن عباس کے پاس جائے اور پوچھے "ایسے شخص کی نسبت تم کیا حکم دیتے ہو جو تمہاری مسجد کے اندر کسی عورت کے ساتھ زنا کرے۔ اور بدکاری کرتا ہوا پکڑا جائے؟" اس حکم کے مطابق راجہ کا ایک وزیر عباس ہنرمن کے پاس آیا اور یہی سوال کیا۔ عباس اس واقعہ کو جانتا تھا۔ اُس مسلمان سے اُسے ہمدردی بھی تھی۔ مگر اُس کی غیرت نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ اسلام کی توہین ہو۔ چنانچہ اُس نے صاف جواب دیا کہ "ہم ایسے شخص کو قتل کر ڈالیں گے۔" اور مسلمانوں ہی سے فیصلہ کرا کے راجہ نے اُس شخص کو قتل کرا ڈالا۔ عباس کو اُس کے قتل کی خبر پہونچی تو اُس مسلمان کی حالت سے کچھ تو شرم معلوم ہوئی اور کچھ عبرت ہوئی۔ غرض کچھ ایسی گھبراہٹ ہوئی کہ راجہ سے چھپ کے وہاں سے بھاگ آیا۔ راجہ اسکی نہایت ہی قدر و منزلت کرتا تھا اور اگر معلوم ہوجاتا کہ وہ جانے والا ہے تو ہرگز نہ آنے دیتا۔

اسی عباس بن ماہان سے سمندر کے بہاؤ کا یہ عجیب واقعہ ہمیں معلوم ہوا کہ ایک بار اُس نے ایک بڑا بھاری ساگون کا لٹھا صیمور سے کسی جہاز پر لدوا کے بھیجا تھا۔ چند روز بعد کیا دیکھتا ہے کہ وہی لٹھا سمندر کی موجوں پر بہتا ہوا آیا اور صیمور کے ساحل پر آکے ٹھہر گیا۔ اس کے متعلق جستجو کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ لٹھا عمان میں جا کے بکا تھا اور وہیں کنارے پڑا ہوا تھا کہ سمندر میں سیلاب آیا اور موجیں وہاں سے اُٹھا کے اُسے پھر سیدھی صیمور میں لے آئیں۔

آگے بڑھ کے ہندوستان کے حالات میں لکھتا ہے :- مجھ سے ایک معتبر سیاح نے بیان کیا کہ میں نے ایک شہر میں بچشم خود دیکھا کہ دو شخصوں نے ایک گڑھا کھودا۔ پھر اُس میں اُپلے رکھ کے ایک بڑی سی چتا بنوائی۔ اُس پر وہ دونوں بیٹھ کے بڑے اطمینان کے ساتھ نرد کھیلنے لگے۔ کھیلتے جاتے تھے۔ بار بار تنبول (پان) اُٹھا اُٹھا کے کھاتے جاتے تھے جو اُن کے پاس تھالی میں رکھے تھے اور کمال فارغ البالی کے ساتھ گاتے جاتے تھے۔ چتا میں نیچے آگ لگادی گئی۔ جو بھڑکتی اور اوپر کی طرف بڑھتی جاتی تھی مگر اُنکے مشاغل میں فرق نہ آتا تھا۔ یہاں تک کہ آگ اوپر پہونچی اور دونوں دم بھر میں جل کے خاک ہو گئے۔

وہ ایک یہ عجیب واقعہ بھی بیان کرتا ہے جو غالباً ہندوستان کے سپاہیوں میں قومی روایات کی شان سے مشہور چلا آتا ہوگا اور دلچسپی سے خالی نہیں ہے :- عبدالواحد بن عبدالرحمٰن قسوی ایک شخص تھا جس نے سالہا سال دریا کا سفر کیا تھا وہ بیان کرتا تھا کہ اہل ہند کی وضع اگلے دنوں یہ تھی کہ سر کے بالوں کا جوڑا تاج یا ٹوپی کی وضع سے عین سر کے اوپر چندیا کے بیچوں بیچ میں رکھا کرتے تھے اور اُن کی تلواریں بالکل سیدھی ہوا کرتی تھیں۔ اتفاقاً ان کے دو گروہوں میں باہم لڑائی ہو گئی۔ ایک گروہ دوسرے پر غالب آیا۔ جس نے اپنے حریف پر قابض و حکمراں ہو کے یہ حکم دیا کہ مغلوب فریق والے اپنے بالوں کے جوڑے بجائے سر کے اوپر کے نیچے کو جھکے ہوئے باندھا کریں اور اُن کی تلواریں بھی سیدھی ہونے کی عوض خمدار ہوا کریں تاکہ اُن کے سر ہمارے سروں کے آگے اور اُن کی تلواریں ہماری تلواروں کے آگے سر بہ سجدہ رہا کریں۔ اُسی وقت سے ہندوؤں میں نیچے جوڑوں اور خمدار تلواروں کا جو قرطل (کرتل۔ کتل) کہلاتی ہیں رواج ہوا۔

(۳۳)

ہندوستان میں ایک خاص قسم کے چور ہوا کرتے ہیں۔ اُن کے گروہ شہروں شہروں مارے مارے پھرتے ہیں اور خوش حال تاجروں کے پاس پہونچتے ہیں عام اس سے کہ اسی ملک کے ہوں یا باہر کے آئے ہوئے۔ اس کی بھی ضرورت نہیں کہ اُن کے گھر میں جائیں کبھی راستے ہی میں گھیر لیتے ہیں۔ ان چوروں کا طریقہ یہ ہے کہ جس سے لینا مقصود ہوتا ہے اُس کا سامنا ہوتے ہی چھریاں نکال لیتے اور اُسے دھمکا کے کہتے ہیں کہ اتنی رقم ہمیں دے ورنہ تجھے مار ڈالیں گے۔ ان لوگوں سے بچنے کا سوا مطلوبہ رقم کے دیدینے کے اور کوئی علاج نہیں ہے اگر کوئی اُس کا دوست یا خود ملک کا راجہ بھی بچانا چاہے تو نہیں بچا سکتا۔ یہ لوگ اپنے مار ڈالے جانے کی پروا نہیں کرتے اور قبل اس کے کہ کوئی شخص اُن پر حربہ کرے یا اُنھیں پکڑے اُس شخص کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ جہاں یہ لوگ کسی کے پیچھے پڑ گئے پھر کسی کی مجال نہیں کہ اُن سے بولے یا اُنھیں ظلم سے روکے۔ اور چونکہ ہر شخص کو اپنی جان کا خوف ہوتا ہے لہذا اُن کے بیچ میں کوئی پڑتا بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص اُنھیں کی مرضی پر چلتا۔ جہاں لیجا کے بٹھائیں بیٹھتا اور مطلوبہ رقم جہاں سے اور جس طرح بنے فراہم کر کے دیدیتا اور اپنی جان چھڑاتا ہے۔ جب تک یہ رقم نہیں ملتی یہ لوگ سر پر چھریاں تانے کھڑے رہتے ہیں۔ وہ کھاتا پیتا یا جو کام کرتا ہے ان کی چھریاں اُس کے سر پر رہتی ہیں جب رقم مل جاتی ہے تو مزدور پر لدوا کے اپنے گھر بھجواتے ہیں اور جب تک آدمی روپیہ گھر پہونچا کے واپس نہ آجائے اُسے اسی طرح چھریوں میں گھیرے بیٹھے رہتے ہیں اور اپنا پورا اطمینان کر لینے کے بعد اُس کا پیچھا چھوڑتے ہیں۔

محمد بن مسلم سیرافی جو کچھ اوپر بیس سال تک مقام تھانہ میں مقیم رہا تھا اُس نے اکثر بلادِ سندھ کا سفر کیا تھا اور یہاں کے لوگوں کے حالات و معاملات سے بخوبی واقف تھا مجھ سے کہتا تھا کہ ایک بار اس قسم کے بارہ مُنڈ چڑھے شہر صیمور اور تھانے میں آئے اور ہندو تاجروں میں سے ایک شخص کو گھیر لیا۔ جس شخص کو اُنھوں نے گھیرا وہ تو چنداں دولتمند نہ تھا مگر اُس کا بوڑھا باپ بڑا مالدار تھا اور اُسکا

اکیلا یہی ایک بیٹا تھا۔ منڈچڑھوں نے اُسے اُس کے گھر پر آکے پکڑا اور دس ہزار اشرفیاں طلب کیں۔ چونکہ باپ پر یہ رقم گراں نہیں گزر سکتی تھی اس لئے بیٹے نے اُسے خبر کی کہ مجھے منڈچڑھوں نے پکڑ لیا ہے اور اتنی رقم مانگتے ہیں۔ آپ ہی دستگیری کیجئے گا تو اس آفت سے چھٹکارا نصیب ہوگا۔ باپ نے آکے منڈچڑھوں کی خوشامد کی کہ مجھ سے ایک ہزار اشرفیاں لے لو۔ مگر اُنھوں نے سماعت نہ کی اور کہا دس ہزار اشرفیوں سے ایک کوڑی کم نہ لیں گے۔ تب وہ بوڑھا راجہ کے پاس دوڑا گیا اور اُس سے ساری کیفیت بیان کرکے کہا "یہ تو بڑی خرابی ہوئی۔ یہی حال ہے تو آپ کے ملک میں کوئی کیسے رہے گا؟" راجہ نے کہا "ہم اس کا کیا بندوبست کریں؟ اگر ذرا بھی بولیں گے تو وہ لوگ تمھارے بیٹے کو مار ڈالیں گے! اُن لوگوں کو سزا دینا امکان میں ہے اور میں دے سکتا ہوں مگر اس سے تمھارے بیٹے کی جان نہیں بچ سکتی اور افسوس یہ ہے کہ یہی تمھارا ایک بیٹا ہے" بڈھے نے کہا "چاہے جو کچھ ہو، مگر میں بیٹے کے لئے فقیر و محتاج نہیں ہو سکتا۔ حضور اُس مکان کے گرد لکڑیوں کا ایک ڈھیر اگوا کے آگ لگا دیں، تاکہ وہ سب کے سب مع مکان کے جل مریں" راجہ بولا "اس طرح تو تمھارا لڑکا بھی جل جائے گا اور اُس کے ساتھ تمھاری بی بی بھی جل کے خاک ہو جائے گی جو اسی مکان میں اپنے بیٹے کے ساتھ ہے" بوڑھا بولا "جل جائیں کوئی مضایقہ نہیں" الغرض راجہ نے اُس کی تدبیر پر عمل کیا۔ اُس کے مکان کے گرد لکڑیوں کا انبار لگا کے آگ لگا دی گئی اور مکان میں اس کے بی بی بیٹے اور سارے مال و اسباب کے جل کے خاک ہو گیا اور اُسی میں وہ منڈچڑھے بھی جل گئے۔

بلادِ ہند اعلیٰ (شمالی) میں بڈھوں اور بوڑھیوں کے زندہ جلا دینے کا رسم آج تک باقی ہے۔

بلاد ذہب (سراندیپ) اور زابج (جاوا) کے راجاؤں کے دربار میں لوگ چار زانو بیٹھا کرتے ہیں اور اس نشست کے خلاف کسی اور وضع میں بیٹھنا آدابِ شاہی کے بالکل خلاف ہے۔ اس نشست کو یہاں والے اپنی زبان میں ہرسیلا کہتے ہیں۔ مسلمان تاجر جو اِن درباروں میں جاتے اُنھیں بھی اس کی پابندی کرنا پڑتی تھی اتفاقاً ایک راجہ کے دربار میں جس کا نام "سرناتا کلہ" (چرن ٹھاکر؟) تھا ایک مسلمان ناخدا گیا جو "جہود کوتاہ" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ وہ اُس کے دربار میں پہونچا اور اسی ایک وضع میں بیٹھے بیٹھے آکے پاؤں رہ گئے۔ چنانچہ اُس نے آپ ہی آپ یہ تذکرہ چھیڑا کہ "ملک عمان میں ایک خاص قسم کی مچھلی ہوتی ہے جو کنعد کہلاتی ہے اور وہ اتنی لمبی ہوتی ہے" یہ کہہ کے اُس کے طول کا اندازہ بتانے کے لئے اُس نے اپنا ایک پاؤں پھیلا دیا اور گھٹنے کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔ پھر دوسرا پاؤں پھیلا کے اُسے کُنج ران کے قریب پکڑا اور کہا "بعض اتنی بڑی ہوتی ہیں" اُس کے یہ حرکات دیکھ کے راجہ متحیر ہوا اور اہلِ دربار سے پوچھا:- "اس وقت مچھلیوں کا کون سا ذکر تھا؟ اس کی اس حرکت میں کوئی بات ضرور ہے" وزراء نے عرض کیا "حضور یہ بوڑھا اور ناتوان شخص ہے، درباری وضع میں بیٹھے بیٹھے پاؤں دکھ گئے تو پاؤں سیدھے کرنے کے لئے اس نے یہ بہانہ پیدا کر لیا ہے" یہ سُن کے راجہ نے کہا:- "مسلمان ہماری اس نشست کے عادی نہیں ہیں لہذا آیندہ دربار کی اس قید سے مسلمان تاجر معاف اور آزاد کئے جاتے ہیں" چنانچہ اب یہ معمول ہے کہ مسلمان لوگ اِن راجاؤں کے دربار میں جس وضع سے چاہیں بیٹھتے ہیں۔

ہندوستان کے عابدوں اور زاہدوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ بیکور کے لقب سے مشہور ہے۔ یہ لوگ دراصل سراندیپ کے رہنے والے ہیں اور اہلِ اسلام سے نہایت ہی اُنس و محبت رکھتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں یہ لوگ بالکل ننگے مادر زاد رہا کرتے ہیں، سوا اس کے کہ ایک چار اُنگل کا چیتھڑا شرمگاہ پر رہتا ہے۔ ایک ڈورا کمر میں بندھا ہوتا ہے (کردھنی) اُسی میں اُسکو اٹکا لیتے ہیں اور جاڑوں میں گھانس وغیرہ کی چٹائیاں اوڑھتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایک لنگی بھی باندھتے ہیں۔ جس میں محض دکھانے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے ہر رنگ کے پیوند لگے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے پنڈوں میں مُردوں کی ہڈیوں کی خاک ملتے ہیں۔ سر منڈاتے ہیں۔ داڑھی موچھوں کے بال اُکھاڑتے ہیں۔ مگر بغلوں اور موے زہار کے دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بعض بعض ناخن بھی کٹوا لیتے ہیں، ورنہ نہیں۔ اور عبرت حاصل کرنے کی غرض سے انسان کے کاسۂ سر میں کھاتے پیتے ہیں۔

اہلِ سراندیپ کو جب بعثت جناب سرورِ کائنات صلعم کے حالات معلوم ہوئے تو اپنے ایک سمجھدار آدمی کو ارضِ حجاز میں بھیجا کہ آپ کے حالات دریافت کر آئے۔ اس شخص کو مدینۂ طیبہ تک پہونچنے میں دیر ہوئی اور جب پہونچا ہے آپ سفرِ آخرت فرما چکے تھے۔ ابوبکر صدیق نے بھی دو سال خلافت کرکے عالمِ آخرت کا راستہ لیا تھا اور حضرت عمر فاروق کے سادے دربار میں حاضر ہوکے جناب رسالت مآب کے حالات دریافت کئے اور کل باتیں معلوم کرکے واپس آیا۔ مگر مکران تک پہونچا تھا کہ راستے میں مرگیا۔ اُس کے ہمراہ ایک ہندو لڑکا تھا جو اُسے خاک مکران کے سپرد کرکے سراندیپ میں واپس آیا۔ اُس نے یہاں آکے حضرت عمر کے تواضع و انکسار۔ آپ کی وضع و قطع اور آپ کے لباس کے حالات لوگوں سے بیان کئے اور کہا کہ آپ گدڑی پہنتے ہیں۔ مسجد میں سوتے ہیں۔ الغرض یہی حالات سُن کے یہاں والوں کو مسلمانوں سے اُنس ہوگیا ہے۔

اہلِ ہند کے نزدیک شراب عورتوں کے لئے حلال اور مَردوں کو حرام ہے۔ مگر بعض لوگ چھپ کے پیتے ہیں۔ چوری ہندوؤں میں بہت بڑا جُرم ہے اور اگر کسی نے چوری کی تو راجہ اُسے قتل کر ڈالتا ہے اور اگر وہ دولتمند ہوا تو اُسکا سارا مال و اسباب ضبط کرلیا جاتا ہے۔ یا اُس پر کوئی بہت ہی بڑا بھاری جرمانہ کیا جاتا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس اگر کوئی شخص جان بوجھ کے چوری کا مال خریدے تو اُس سے بھی بڑا بھاری جرمانہ وصول کیا جاتا ہے۔ مگر اصلی سرقہ کی سزا قتل ہی ہے۔ لیکن اس سرزمین پر اگر کوئی مسلمان چوری کرے تو اُسے مسلمانوں کا "ہنرمن" شریعتِ اسلام کے مطابق سزا دیتا ہے۔ بلادِ ہند میں مسلمانوں کے قاضی ہنرمن ہی کہلاتے ہیں۔ اور ہنرمن ہمیشہ مسلمانوں میں سے منتخب کیا جاتا ہے۔

معزز ہندو تاجر اور فوجی لوگ اسی طرح معزز گھرانوں کی خاتونیں یہاں تک کہ وہ بھی جو کسی راجہ کی محبوبہ اور ملکہ ہوں گائے بیل کی لید (گوبر) لئے بازاروں اور راستوں میں علانیہ آتی جاتی نظر آتی ہیں اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔

اہلِ ہند جانوروں کو ذبح نہیں کرتے بلکہ مُردار کھاتے ہیں۔ بکری یا طائر کا سر تلوار سے کاٹ ڈالتے ہیں اور جب وہ مرجاتا ہے تو اُس کا گوشت کھاتے ہیں۔ یہ لوگ چوہے بلی کھاتے ہیں جو یہاں کی نہایت لطیف غذا ہے۔

بزرگ بن شہریار کے سفرنامہ سے ہم اسی قدر واقعات اخذ کرسکے۔ اس کے علاوہ اُس میں جو اور واقعات مذکور ہیں اُن کو ہندوستان سے تعلق نہیں۔ لیکن ان باتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں تو بالکل صحیح ہیں اور بعض باتوں میں ہندوستان کے متعلق عرب تاجروں میں غلط فہمیاں بھی تھیں۔ ہندوستان ایسا ملک ہے جس میں صدہا اقوام اور ہزاروں ذاتیں ہیں۔ اور ہر ایک کی معاشرت بالکل جدا۔ لہذا ان سیاحوں اور تاجروں میں سے اگر کسی نے کسی ایک شخص کو کوئی کام کرتے دیکھ لیا تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عام ہندوستان میں مروج ہے اور یہ لوگ اپنی غلطی سے اُس پر یقیناً عام رائے قایم کرلیا کرتے ہوں گے۔

تنقیدی اشارے

پروفیسر آلِ احمد سرور ریڈر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کے اُنیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ پروفیسر سرور اس عہد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور ان کے تنقیدی مقالات سندی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۳۲۰ صفحات۔ کاغذ ۲۸ پونڈ۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول۔

منیجر نگار لکھنؤ

گاہے گاہے باز خواں!

علم و یقین ۔ اعتقاد و مذہب

آپ روز سورج کو طلوع کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، جتنا وہ اُفق سے بلند ہوتا جاتا ہے اس کی حرارت کو زیادہ محسوس کرتے جاتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ وہ آپ کے سر سے گزرتا ہوا دوسری سمت کی طرف ڈھل جاتا ہے اور رفتہ رفتہ نگاہوں سے غائب ہو جاتا ہے ۔ یہ کیا ہے ؟ ۔ آپ اسے واقعہ کہتے ہیں کیوں ؟ اس لئے کہ آپ کا مشاہدہ ہے، آپ اپنے حواس کے ذریعہ ایسا محسوس کرتے ہیں اور متواتر و پے در پے اتنی مرتبہ محسوس کر چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپ سے آکر یہ کہے کہ آج آفتاب نے طلوع نہیں کیا، یا یہ کہ طلوع کرنے کے بعد غروب نہیں ہوا تو آپ اسے جھوٹا کہدیں گے اور آپ باہر نکل کر اس کی تصدیق بھی نہیں کریں گے ۔ انسان میں جو یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا نام یقین ہے ۔ اور یقین بھی ایسا جس کے لئے کسی برہان و دلیل کی حاجت نہیں ۔

انسان کی زندگی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک سلسلہ ہے بے شمار "لمحات احساس" کا یہاں تک کہ اگر آپ اس کو "احساس مسلسل" کہدیں تو بیجا نہ ہوگا، لیکن "احساس محض" بیکار ہے اگر دنیا میں 'محسوسات کا وجود نہ ہو' اس لئے انسان فطرتاً مجبور ہے کہ وہ اپنے "ذوق احساس" کو پورا کرنے کے لئے محسوسات کا مطالعہ کرے، انسان فطرتاً سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور سکون نام ہے صرف "یقین" کا ۔ ریب و شک، ایک بے چینی ہے، ایک اضطراب ہے اور انسان اس اُلجھن کے دور کرنے پر قدرت کی طرف سے مجبور ہے اس لئے اگر اس کے "احساسات" مطمئن نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ "سکونِ یقین" کی منزل سے ناآشنا ہے ۔ اور "احساس" کا اطمینان اگر ہو سکتا ہے تو صرف محسوسات کی جستجو کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچنے سے ۔

عام طور پر محسوسات کی دو قسمیں بتائی جائیں، ایک محسوسات خارجی، دوسرے محسوسات ذہنی ۔ یعنی ایک وہ جو خارج میں موجود ہیں جیسے درخت، پتھر، پانی وغیرہ اور دوسرے وہ جن کا بظاہر وجود نہیں پایا جاتا لیکن ہم انھیں محسوس کرتے ہیں جیسے گرمی، سردی وغیرہ ۔ مگر میرے نزدیک یہ تقسیم صحیح نہیں کیونکہ محسوسات جتنے بھی ہیں تمام تر خارجی ہیں اور جن کو "ذہنی" کہا جاتا ہے وہ بھی کسی نہ کسی واسطہ سے محسوسات خارجی ہی سے پیدا ہوتے ہیں، یقیناً گرمی سردی کوئی مادی محسوس چیز نہیں لیکن جن اسباب کے تحت گرمی یا سردی محسوس کی جاتی ہے، وہ "خارجی" محسوسات سے باہر نہیں ۔ بیشک محبت و نفرت کا احساس بالکل ذہن سے متعلق ہے لیکن کیا وہ چیز جن سے یہ جذبات متعلق ہیں خارج میں موجود نہیں ؟ مادہ اور اعراض دو علٰحدہ علٰحدہ چیزیں بتائی جاتی ہیں، درانحالیکہ عرض کا وجود مادہ سے کہیں علٰحدہ نہیں، پھول ہے تو رنگ بھی ہے، بو بھی ہے وہ نہیں تو یہ بھی نہیں ۔

یقین کے کئی مراتب و مدارج ہیں ۔ ہم دور سے دھواں اُٹھتا ہوا دیکھتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ وہاں آگ کا وجود ہے،

لیکن آگ کی نوعیت کیا ہے اس کی خبر نہیں ہوتی، ہم چل کر وہاں جاتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کسی نے خس و خاشاک جمع کرکے اس میں آگ لگادی ہے ۔ ہم وہاں سے واپس آتے ہیں، لوگ پوچھتے ہیں کہ آگ کیسی ہے ؟ ہم بتادیتے ہیں، وہ سُنکر مطمئن ہوجاتے ہیں، لیکن کیا ان کا یہ اطمینان اس درجۂ یقین کو پہونچ سکتا ہے جو ہمیں حاصل ہے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ہم کہدیتے کہ کسی نے لکڑی جلائی ہے اور وہ یقین کرلیتے ۔

ہمیں ایک گھڑا مٹی کا نظر آتا ہے، اس کی تازگی دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ اس میں پانی ہے، قریب جاکر پانی کو دیکھتے ہیں تو یقین ہوجاتا ہے، لیکن جب گلاس میں پانی لے کر پی لیتے ہیں تو یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ سرد ہے یا گرم ۔

غور کیجئے کہ یقین کے ان تمام مدارج میں "مطالعۂ محسوسات" کو کتنا دخل ہے اگر خود اپنی سعی و کوشش سے کام لے کر خود اپنی عقل و احساس کو ذریعہ بناکر کوئی علم حاصل ہو، تو وہ "یقین ذاتی" ہے جسے کوئی قوت متزلزل نہیں کرسکتی، لیکن اگر ہم نے صرف دوسروں کی زبانی سُن کر کسی بات کو باور کرلیا ہے تو وہ محض "یقین روایتی" ہے جس میں ریب و تزلزل کا زیادہ امکان ہے اور تصدیق قلب کا بہت کم ۔

تصدیق کی یہ منزل، سکون نفس کا یہ مرتبہ ازخود حاصل ہونے والی چیز نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے محسوسات و موجودات کے مطالعہ سے، پھر یہ مطالعہ جتنا غائر ہوگا اتنا ہی بلند ہوگا اور یہی وہ چیز ہے جس نے دُنیا میں علوم و فنون کی بنیاد ڈالی اور انسان کے اقتدار کو تمام روئے گیتی پر قایم کرکے اسے خلافت الٰہی کی منزل سے روشناس کیا ۔ آیئے ذرا مدارج خلافت پر بھی غور کریں۔

میں ایک وزنی گیند ہوا میں اُچھالتا ہوں، وہ فوراً نیچے آجاتی ہے۔ بار بار پھینکتا ہوں وہ بار بار زمین پر آکر گرتی ہے۔ میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ بھاری چیز کبھی اوپر نہیں ٹھہر سکتی۔ دوسرا شخص اس پر زیادہ غور کرتا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ وزن خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ نام ہے صرف کشش زمین کا۔ تیسرا ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور سوچتا ہے کہ زمین کی کشش کا مقابلہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ غبارہ اور ہوائی جہاز بناکر اس مقاومت میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ آج دُنیا کا تمام ہنگامۂ ترقی اسی مطالعہ پر قایم ہے اور اسی یقین کی سرزمین سے ارتقاء کے چشمے پھوٹتے ہیں، ایک زمانہ وہ تھا کہ انسان کو خود اپنے ملک کی بھی خبر نہ تھی، آج وہ نہ صرف کرۂ ارض بلکہ فضا میں تیرنے والے کروروں اور اربوں میل دور کے کروں کا حال معلوم کرچکا ہے ۔ یہ سب کرشمے ہیں یقین کے، جو نتیجہ ہے علم کا ۔

ایک شخص سوال کرتا ہے کہ اس تمام جدوجہد سے فایدہ ؟ جبکہ انسان کو بہرحال فنا ہونا ہے۔ سوال ممکن ہے صحیح ہو۔ لیکن استدلال غلط ہے ۔ انسان انفرادی حیثیت سے فانی ہے، لیکن اجتماعی حیثیت سے اس کو بقاء دوام حاصل ہے۔ انسان کی موجودہ صورت بدل سکتی ہے، اس کے عادات و اطوار میں تغیر ہوسکتا ہے، اس کے افراد یقیناً فنا ہوتے جائیں گے، لیکن انسان بہرحال باقی رہے گا۔ کرۂ ارض پر نہ سہی، کسی اور کرہ میں۔ انسان فطرت کی تخلیق کا مظہر اتم ہے اور اگر آفرینش کو فنا ہے تو انسان کو بھی ہے ورنہ نہیں۔ اس لئے انفرادی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنا مقتضائے فطرت کے خلاف ہے، قدرت کی مرضی کے منافی ہے۔

آپ سمندر کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک نا متناہی سلسلہ ہے موجوں کا، درانحالیکہ ہر موج اپنی جگہ اُٹھ کر فنا ہوجاتی ہے پھر کیا سمندر کا وجود ان موجوں کے فنا ہونے سے ختم ہوجاتا ہے، جو موج اس لمحہ میں نمودار ہوکر فنا ہوئی ہے اُسے پھر نہیں اُبھرنا، لیکن کیا اس سے سمندر کو کوئی نقصان پہونچ سکتا ہے، بالکل یہی عالم انسانی کا ہے کہ اس کے افراد مٹتے جاتے ہیں لیکن وہ علی حال اپنی جگہ قایم ہے اور ہمیشہ قایم رہے گا۔

دُنیائے مذہب کے اُصول مگر کچھ اور ہیں وہاں سلم و یقین کا نام اعتقاد ہے اور اس کی تعلیم "کل شیئ حادث" (ہر چیز فنا ہونے والی ہے) کی بنیاد پر قایم ہوتی ہے۔ مذہب کے نزدیک انسان نہایت حقیر، حد درجہ بے بس و بے کس اور مجبور و لاچار چیز ہے، اس کی کوئی حرکت اور اس کا کوئی خیال اس کے اختیار میں نہیں، جو چاہتا ہے خدا کرتا ہے اور جو چاہے گا کریگا انسان کا کام صرف سر عجز جھکا دینا ہے اور آنکھ بند کرکے، ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑکر دوسری دنیا کے اس عمیق و تاریک غار کی طرف چلا جانا جس کا علم صرف اس قدر حاصل ہے کہ "کچھ معلوم نہیں"۔

مذہب کہتا ہے کہ انسان دُنیا میں صرف اس لئے آیا ہے کہ وہ عبادت کرے اور خدا کی پرستش میں رات دن مصروف رہے۔ لیکن اس سے پوچھئے کہ خدا کیا، اور اس کی پرستش کیوں؟ تو وہ کہتا ہے کہ خدا کی حقیقت پوشیدہ ہے کسی کی قدرت نہیں کہ اس کو سمجھ سکے اور عبادت اس لئے کہ اس نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے، اس نے جس کا حال معلوم نہیں، الغرض مذہب کے تمام عقاید کا عنصر عظیم "عدم علم" ہے اور اسی نہ سمجھ سکنے، نہ جان سکنے کا نام وہاں یقین رکھا جاتا ہے۔

پھر اگر یہ "عدم علم" کوئی مستقل تعلیم ہوتی تو بھی ایک بات تھی۔ لیکن چونکہ انسان کی فطرت جستجو پسند ہے اور وہ اسوقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک اس کی یہ خلش دور نہ ہو، اس لئے مذہب اس پر بھی قایم نہ رہ سکا اور باوجود اس کے کہ وہ خود خدا کو نہیں سمجھ سکا تھا، لیکن لوگوں کو اس نے سمجھایا، باوصف اس کے کہ وہ دوسری دنیا سے بے خبر تھا لیکن دوسروں کو اس سے آگاہ کیا اور اس شان سے کہ اس اعتماد و یقین کے ساتھ کہ یہ سب کچھ گویا حقایق ثابتہ میں شامل ہے اور محسوسات ظاہری سے متعلق۔

چنانچہ وہی جس کی کنہ حقیقت کو وہ نہیں پاسکتا تھا دفعۃً خفا سے ظہور میں آجاتا ہے اور اس انداز سے کہ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، چاروں طرف اس کے خدام (ملائکۂ مقربین) حضوری میں حاضر ہیں، وہ اپنے خاص خاص بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے، جس سے خوش ہوتا ہے اس کو باغوں میں بھیجدیتا ہے جس سے برہم ہوتا ہے اس کو آگ میں جھونک دیتا ہے، وہ سنتا ہے لیکن کان نہیں رکھتا وہ دیکھتا ہے مگر آنکھوں سے نہیں، وہ بولتا ہے مگر زبان سے نہیں، الغرض وہ دنیا ہی کے بادشاہوں کی طرح ایک جلیل القدر بادشاہ ہے اور اس پر کوئی حکمراں نہیں۔

وہ بے نیاز مطلق ہے، لیکن ہماری عبادتوں کی پروا ضرور کرتا ہے وہ احتیاج سے بلند و ارفع ہے، لیکن ہمارے عجز و نیاز کی اس کو ضرورت ہے۔ وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا، لیکن نافرمانی سے اس کو غصہ یقیناً آتا ہے وہ بے انتہا رحم و کرم والا ہے، مگر گنا ہگار کو بغیر آگ میں جھونکے نہیں مانتا۔

وہ موجود ہے لیکن زمان و مکان سے بے نیاز، وہ ہر لمحہ میں، قدیم ہے، لیکن لمحہ فنا ہوجاتا ہے اور وہ نہیں، وہ عادل ہے لیکن عدل کا پابند نہیں، جس کو چاہے بخشدے اور جسے چاہے سزا دے۔ علم کہتا ہے کہ یہ اجتماع اضداد کیسا، مذہب کہتا ہے، خدا کی مرضی ——— علم کہتا ہے کہ یہ تمام باتیں کیونکر معلوم ہوئیں، مذہب کہتا ہے، خدا کے برگزیدہ بندوں کے کہنے سے، علم کہتا ہے کہ اس کی برگزیدگی کا علم کیونکر ہوا، جواب ملتا ہے کہ انھیں کے قول سے — علم سوال کرتا ہے کہ کیا انسان بغیر تحقیق کئے ہوئے محض دوسروں کے کہنے پر اپنے نفس کو مطمئن کرسکتا ہے جواب دیا جاتا ہے "کیوں نہیں" علم پوچھتا ہے کہ کیا یقین اسی کا نام ہے، مذہب کہتا ہے "بیشک"

مذہب کی تعلیم ہے کہ یہ دُنیا جس میں انسان زندگی بسر کرتا ہے، یعنی محسوسات کی یہ ٹھوس دُنیا بالکل عارضی چیز ہے اور محض ایک پرتو ہے اس دوسری دنیا کا جو ہمیشہ قایم رہنے والی چیز ہے — مگر وہ دوسری دنیا کیسی ہے؟ اس میں بہشت ہے،

دوزخ ہے ۔ دیدار خداوندی ہے یا اس سے مہجوری ۔ باغ و راغ ہیں، حور و قصور ہیں، فواکہ و اثمار ہیں، دودھ اور شہد کی نہریں ہیں ۔ کوئی فکر نہیں، ہر وقت آزادی سے کھاؤ پیو اور وہ سب کچھ کرو جس سے اس دُنیا میں باز رکھا جاتا ہے ! پھر دہکتی ہوئی آگ کے غار ہیں، اژدہے ہیں، بچھو ہیں، خون و پیپ ہے، چیخ ہے، کراہ ہے ۔ پوچھئے :-

کیا وہاں رقص و سرود بھی ہے ـــ کیوں نہیں درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی ہوں گی ۔

کیا وہاں موٹر، ہوائی جہاز، ریل بھی ہے ـــ بیشک ہے، انسان نے کسی جگہ پہونچنے کا خیال کیا اور فوراً پہونچ گیا یعنی

"آنکھ کی بند ہوا کوچۂ جاناں پیدا"

کیا وہاں "زہرۂ صبح و جام بلور" بھی میسر ہے ـــ اس کا کیا ذکر کیونکہ وہاں تو ہر وقت صبح صادق ہی رہے گی اور جام بلور کیا معنی، وہاں تو دُنیا کے قیمتی سے قیمتی جواہر سنگریزوں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آئیں گے ـــ بالکل درست لیکن پوچھئے کیا انسان کو کسی شے کے حصول کے لئے جد و جہد کرنا پڑے گی، کیا یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ ممکن ہے فلاں چیز ہم کو نہ ملے یا ملنے کے بعد ہاتھ سے نکل جائے ۔ اس کا جواب بالکل نفی میں ملے گا ۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ فطرت انسانی تو بدستور اس دنیا میں بھی یہی رہے گی، لیکن لذت و الم کا مفہوم بالکل بدل جائے گا ۔ گویا ان کا وجود احساس انسانی اور اس کی فطرت سے علٰحدہ قایم ہے ۔

اب ذرا گہرائی کی طرف جایئے اور غور کیجئے کہ مرنے کے بعد انسان کا ایک زمانۂ غیر معلوم تک عالم برزخ میں رہنا اور پھر بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز "پل صراط" پر چل کر دوزخ یا جنت تک پہونچنے کا کیا غایت رکھتا ہے، کہا جاتا ہے کہ مصلحتِ خداوندی ہر جگہ اور ہر بات میں کارفرما ہے ۔ لیکن موت کے بعد انسان کا تمام سخت و صعب مراحل سے گزر کر عذاب یا ثواب کی دائمی زندگی بسر کرنا کس نتیجہ کے لئے ہے، بہشت و دوزخ سے کسی کو لوٹ کر پھر دنیا میں جانا نہیں کہ وہاں کے لوگوں کو ان کے حالات معلوم کر کے تخویف یا ترغیب ہو ۔ پھر خدا کی اس میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کو زندگی دوام عطا کر کے بقا میں اپنا شریک تو بنا لیتا ہے لیکن دُنیا والوں کے لئے مایۂ عبرت و بصیرت بنانے کے لئے طیار نہیں ۔

صدیاں گزر گئیں کہ مذہب کی یہ تعلیمات بدستور اسی طرح اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے دُنیا میں کارفرما ہیں، یہاں تک کہ علم نے بڑھکر اس کو چیلنج دیا، ظاہر ہے کہ مشاہدات کا جواب قیاسات سے اور "یقینیات" کا مقابلہ "ممکنات" سے نہیں ہو سکتا تھا، اس سے ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے عقاید مذہب کے ظاہری معنی سے عدول کر کے ایک باطنی مفہوم پیش کیا اور بتایا کہ یہ صرف تشبیہات و استعارات ہیں، لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے خطیبانہ انداز بیان ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ مراسم و شعائر میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکا اور اس جواب کی حقیقت جان چھڑانے سے زیادہ اور کچھ نہ رہی، علم کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا، سیلاب کی طرح اٹھا اور درمیان کے تمام چٹانوں کو کاٹتا ہوا چلا گیا ۔ جن چیزوں کے ساتھ دینا تھا وہ ساتھ چلی گئیں، جن کو یہ منظور نہ تھا وہ اپنے منتشر اجزاء لئے ہوئے پیچھے رہ گئے ۔ اور مذاہب عالم کا یہی حشر ہوا ۔

مگر دنیا کے تمام مذاہب میں ایک مذہب ایسا تھا جو اس طوفان کا ساتھ دے سکتا تھا، علم کے اس سیلاب کا شناور بن سکتا تھا، لیکن اس کو دنیا فراموش کر چکی ہے، خود اس کے ماننے والے اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور اگر انھیں کوئی یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے تو اُسے باغی سمجھ کر نکال دیتے ہیں ـــ اس مذہب نے کبھی اس بات کی تلقین نہیں کی کہ تم بغیر سمجھے ہوئے لغو اعتقادات کا اتباع کرو بلکہ اس نے ہمیشہ اسی بات پر زور دیا کہ اپنی فکر کو کوشش سے کام لو، غور و تدبر کرو، کائنات کا مطالعہ کر کے حقایق اشیاء کا علم حاصل کرو، دنیا میں ہمیشہ آگے قدم بڑھاؤ اور ترقی کی اس چوٹی تک پہونچ جاؤ جہاں سے

نیابت خداوندی کا اعلان کیا جا سکتا ہے، اس نے یہ بھی بتایا کہ نیابت خداوندی کیا ہے، وہ انسان کی انتہائی کامیاب تمناؤں
کی بہشت ہے، استعلاء و ترقی کی سکوں بخش جنت ہے، کامرانیوں کی سلسبیل ہے، مسرتوں کی جوئبار ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی
سمجھا دیا کہ اگر انسان نے یہ سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی، تو ذلت و نکبت کی آگ ہے، پستی و خسران کے دل جلا دینے
والے شعلے ہیں اور پامالی کی وہ تکلیفیں ہیں کہ سانپوں کی پھنکار اور بچھو کے نیش بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

مگر ہے کوئی آج، جو صرف اس تعلیم کو اساس مذہب بتائے، اور ہے کسی میں ہمت جو پوست کو علٰحدہ کر کے مغز پیش کرے، علم
و "یقین" کا پرچم لئے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا ہے، کائنات کو فتح کر کے بہشتوں اور جنتوں کو اپنے لئے مخصوص کرتا جا رہا ہے، نعایم
و لذایذ کو سمیٹ سمیٹ کر دامن مراد بھر رہا ہے — لیکن مذہب بدستور اپنے ممکنات کے اوہام میں مبتلا ہے، قیاسات کی دلدل میں
گرفتار ہے اس نے منہ پشت کی طرف کر لیا ہے اور کہہ رہا ہے منزل ادھر ہے۔ وہ سکون کا طلبگار ہے وہ سکون جس میں موت کی سی
غفلت ہو، پتھروں کا سا جمود ہو، وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کی پامالی دوسری دنیا کا عروج ہے، یہاں کی ذلت وہاں کی عزت ہے،
حالانکہ بتانے والے نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ "ہل یہلک الا القوم الفاسقون" سے اسی دنیا کی ہلاکت مراد ہے اور فاسق وہی
ہے جس نے اسی آب و گل کی دنیا میں جدوجہد ترک کر دی

نگار بک ایجنسی کی کتابیں

آرڈر کے ساتھ چوتھائی قیمت پیشگی آنا چاہیئے

پیشگی آنا چاہیئے

عظیم بیگ چغتائی کے ناول

جنت کا بھوت ---------- ۱۲ر
فل بوٹ ---------- ۸ر
لفٹنٹ ---------- ۸ر
شریر بیوی ---------- ۸ر
اردوئے قدیم ---- شمس اللہ قادری ---- ۸ر
تنقیدی مضامین ---- اثر لکھنوی ---- ۸ر
تاریخ مغربی یورپ ---- تنہا بی۔ اے ---- ۸ر
تاریخ اندور ---- امیر احمد علوی ---- ۸ر
دیوان درد ---------- ۸ر
دیوان ظفر ---------- ۱۲ر
سیرۃ آل عباس ---- از سید فرید ---- ۸ر
سیرۃ النعمان ---- شبلی ---- ۸ر
سیرۃ مصطفےٰ کمال ---- ۸ر
تصاویر ذوق ---- مرتبہ ۸ر

مراۃ محمدی (تاریخ گجرات) ---------- ۸ر
مشاطۂ سخن (اساتذہ کی اصطلاحیں) صفدر مرزا پوری --- للعہ ۸ر
شرح کلام غالب ---- آسی ---------- ۸ر
دیوان رنگین ---------- ۸ر
راجپوت اور مغل زن و شو کے تعلقات -- از صمدانی --- ۱۲ر
رموز کنایات ---- فراق گورکھپوری ---- ۸ر

بچوں کی کتابیں

آخری نبی: ۲ر ---- سرکار کا دربار ---- ۸ر
پڑوسی: ۸ر ---- رات کی رانی: ۵ر
لطایف اکبر و بیربل: ۸ر ---- پانچ قہقہے: ۸ر
ٹھگوں کا استاد: ۳ر ---- زہرہ پری: ۵ر
بے رحم بادشاہ: ۷ر ---- انقلابی مولوی: ۵ر
سفید کبوتر: ۲ر ---- سگھڑ سہیلی: ۲ر
آنحضرت ---------- ۸ر
نقلی شہزادہ ---------- ۲ر

جدید فارسی لُغت کی ضرورت

دُنیا میں اس وقت کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو اس بات کا دعویٰ کرسکے کہ وہ کسی دوسری قوم کی زبان سے کبھی متاثر نہیں ہوئی ——— کیونکہ انسان ایک متمدن مخلوق ہے اور مختلف ممالک کے مختلف افراد جب ایک دوسرے سے ملیں گے تو ظاہر ہے کہ ایک قوم کی زبان کا اثر دوسری قوم کی زبان پر ضرور پڑے گا

لیکن پچھلے ایک قرن کے اندر قومیت و ملّت کے احساس کے ساتھ یہ جذبہ بھی بعض قوموں میں پیدا ہوا کہ غیر زبانوں کے الفاظ اپنی زبانوں سے نکال دیں، چنانچہ اس سلسلہ میں ترکی نے مصطفےٰ کمال کے عہد میں اور ایران نے رضا شاہ پہلوی کے زمانہ میں اس بات کی بہت کوشش کی

ترکی کو تو خیر ایک حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی، لیکن ایرانی زبان میں آج بھی بکثرت عربی الفاظ مستعمل ہیں اور وہ ان کو اس لئے نہ نکال سکے کہ یا تو ان کے مترادف الفاظ فارسی زبان میں نہیں پائے جاتے یا پھر یہ کہ وہ اسقدر مقبول ہوچکے ہیں کہ ان کا زبان سے خارج کرنا آسان نہیں۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کا پارسی زبان میں اختلاط کوئی نئی چیز نہیں بلکہ بڑی پُرانی بات ہے

ہخامنشی عہد میں بھی سامی قوموں کے میل جول سے، پارسی زبان میں کلدانی، اشوری او۔ آرامی الفاظ بکثرت شامل ہوئے اور اسکندر مقدونی کی فوجی مہموں کے زمانہ میں یونانی الفاظ سے بھی پارسی زبان آشنا ہوئی۔ یہاں تک کہ قدیم خط میخی، یونانی رسم خط میں تبدیل ہوگیا اور اشکانی عہد کے ابتدا تک یہی حالت رہی

اس کے بعد یونانی زبان و رسم خط کی اہمیت ختم ہوکر، آرامی اور سریانی نے اس کی جگہ لے لی، اور پھر ساسانیوں کے زمانہ میں یہ کوشش شروع ہوئی کہ پارسی زبان کے متروک الفاظ کو پھر استعمال کیا جائے، چنانچہ اس سلسلہ میں یونانی الفاظ کی جگہ بہت سے فارسی اور آرامی الفاظ بھی مستعمل ہونے لگے اور آرامی رسم خط پہلوی رسم خط میں بدلدیا گیا

اس کے بعد جب ظہورِ اسلام ہوا اور عربوں نے ایران پر حملہ کرکے اسے مسلمان بنالیا تو بہت سے مذہبی الفاظ مثلاً صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ وغیرہ، پارسی زبان میں داخل ہوگئے لیکن خلفاء امویین کے عہد تک زبان بدستور پارسی رہی اور رسم خط پہ اس کے بعد عہدِ بنی امیہ خصوصاً عبدالملک مروان کے زمانہ میں حالات بدلے اور اس نے حکم دیا کہ تمام قلمرو حکومت میں عر زبان کو رائج کیا جائے اور مکاتیب و فرامین عربی میں لکھے جائیں۔ اس سختی کا یہ اثر ہوا کہ مصر و شام وغیرہ نے تو اپنی ملیت و قومیت تک بدل دی اور زبان بھی بالکل عربی اختیار کرلی، لیکن ایران اس حد تک نہیں جھکا اور اپنی زبان و قومیت ہاتھ سے نہیں دیا، البتہ خط پہلوی کی جگہ اس نے خط کوفی ضرور اختیار کرلیا

عہدِ امویہ کے اختتام تک حالات یہی رہے لیکن جب عباسی دور شروع ہوا تو ہوا کا رخ بدلا اور ایران و عرب کے ثقافتی تعلقات زیادہ خوشگوار ہوگئے، یہاں تک کہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے زمانہ میں تو یہ تعلقات اتنے وسیع ہوگئے کہ ایک زبان کی تصانیف دوسری زبان میں بکثرت ترجمہ کے ذریعہ سے منتقل ہونے لگیں اور آہستہ آہستہ اکثر فضلاء

ایران کی زبان عربی ہی ہوگئی

اس میں شک نہیں کہ یہ زمانہ پارسی زبان کے لئے بہت سخت تھا اور عربی زبان کے اثرات سے وہ حد درجہ متاثر ہو رہی تھی، لیکن ایران کے جذبات وطن پرستی ابھی تک بالکل محو نہ ہوئے تھے اور وہ اس لسانی انقلاب کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ یعقوب لیث نے پرچم استقلال بلند کیا اور ایران کو عرب حکومت سے آزاد کرا کیا

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارسی زبان میں پھر از سر نو جان پڑ گئی اور سامانیوں کے زمانہ میں فارسی ادب نے پھر اک کروٹ لی۔ رودکی و دقیقی اسی زمانہ کی پیداوار ہیں۔ اس کے بعد غزنوی عہد میں یہ نہضت ادبی اپنے کمال کو پہونچ گئی اور فردوسی عنصری، اسدی اور فرخی ایسے شعراء باکمال پیدا ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود پارسی زبان کوئی علمی زبان نہ بن سکی اور علمی کتابیں اکثر و بیشتر عربی زبان ہی میں لکھی جاتی رہیں۔ صرف چند علماء جیسے بوعلی سینا، رازی، غزالی، طوسی، شیرازی اور قطب بازی وغیرہ ایسے تھے جنھوں نے بعض کتابیں فارسی میں لکھیں ورنہ اکثر تصانیف عربی زبان ہی میں کی گئیں

اس کے بعد جب چنگیزی و تیموری تاخت شروع ہوئی تو ترکی اور مغلی لغات، فارسی زبان میں داخل ہونا شروع ہوئے اور ان کا اثر و نفوذ آہستہ آہستہ بہت بڑھ گیا۔ الغرض فارسی زبان دوسری قوموں اور زبانوں سے ہمیشہ متاثر ہوئی (اور ہر زبان آپس کے میل جول سے خواہ وہ کسی صورت سے ہو اسی طرح متاثر ہوتی ہے) اور رضا شاہ پہلوی کے زمانہ تک کسی نے اس طرف خاص توجہ بھی نہیں کی

رضا شاہ کو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ فارسی زبان کو بیرونی اثرات سے پاک کرنا چاہئے اور اس میں شک نہیں کہ ان کے زمانہ میں زبان کے اندر بہت سے نئے الفاظ اختراع کر کے شامل کئے گئے، لیکن اب دوسری مصیبت یہ تھی کہ مغربی تعلقات کی وجہ سے مغربی زبان کے الفاظ داخل ہونا شروع ہوئے، جن کو قبول کرنا ضروری تھا کیونکہ علوم و فنون جدیدہ کے سلسلہ میں بکثرت ایسے الفاظ سامنے آئے جن کا ہم معنی لفظ فارسی میں موجود نہ تھا اور ان کا استعمال ضروری تھا۔ پھر ایرانیوں نے یہ تو ضرور کیا کہ مغربی الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنے ملکی لب و لہجہ کے لحاظ سے ان کی صورت بدلدی لیکن وہ ان کو اپنی زبان سے بالکل نکال نہ سکے

چنانچہ اس وقت پارسی زبان میں آپ کو عربی اور ترکی لغات کے علاوہ بہت سے الفاظ مغربی زبانوں کے بھی ملیں گے اور جب تک ان سب پر عبور نہ ہو موجودہ ایرانی لٹریچر سے مستفید ہونا مشکل ہے۔ جدید فارسی میں بہت سے نئے الفاظ وہ ہیں جو خود انھوں نے وضع کئے ہیں اور ان کا سمجھنا غیر ایرانی لوگوں کے لئے اور زیادہ دشوار ہے

ہندوستان میں فارسی کی وہ مکتبی تعلیم جس میں باقاعدہ کلاسکل فارسی کی تعلیم ہوتی تھی بالکل ختم ہوگئی ہے اسکولوں اور کالجوں میں البتہ اس کا نشان کہیں کہیں ملتا ہے، لیکن چونکہ ابتدائی تعلیم فارسی کی نہیں ہوتی اور محض فرہنگوں کی مدد سے نصاب کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اس لئے کوئی صحیح ذوق فارسی زبان کا طلبہ میں پیدا نہیں ہوتا اور جدید فارسی سے تو وہ بالکل ناآشنا رہتے ہیں کیونکہ کالجوں کے فارسی اساتذہ بھی اکثر و بیشتر اس سے واقف نہیں

اس لئے ان حالات کے پیش نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کا کوئی جدید لغت مرتب کیا جائے جو قدیم و جدید فارسی دونوں کے ضروری الفاظ پر مشتمل ہو اور اسے مسلسل نگار میں اس طرح شایع کیا جائے کہ اخیر میں وہ ایک کتاب کی صورت اختیار کر لے

اس کے لئے اخیر کے کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ چار صفحات مخصوص کر دئے جائیں گے تاکہ انھیں آسانی کے ساتھ رسالہ سے علیحدہ کر کے محفوظ کر لیا جائے اور جب یہ سلسلہ ختم ہو تو ان تمام اوراق کو کتابی صورت میں مجلد کرایا جا سکے

یہ ہے میرا ارادہ و خیال، لیکن اس پر عمل اسوقت شروع ہوگا جس میں قارئین نگار کو اس سے متفق پاؤں گا۔ اگر انھوں نے اس تجویز کو پسند کیا تو آیندہ ماہ سے یہ سلسلہ شروع کر دیا جائے گا، اس امید کے ساتھ کہ نگار کے پڑھنے والے، اپنے حلقۂ اثر میں بھی اس کی توسیع اشاعت کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ کیونکہ کتابی صورت میں تو اس لغت کی اشاعت آسان نہیں اور اس طرح نگار کے ساتھ ساتھ لوگوں کو یہ مفید لغت بھی بغیر کسی مزید صرف کے ہاتھ آجائے گا۔ نگار کے مطالعہ کرنے والوں سے استدعا ہے کہ ایک کارڈ بھیج کر وہ اپنی رائے سے ہمیں جلد از جلد مطلع فرمادیں تاکہ تحریر و ترتیب کا کام شروع کر دیا جائے اور آیندہ ماہ اکتوبر سے اس کا آغاز ہوجائے۔

اڈیٹر

(بقیہ مطبوعات موصولہ صفحہ ۵۶)

اس مجموعہ کی ابتدا میں ہری چند اختر ام۔ اے کا ایک طویل مقدمہ نظر آتا ہے جس میں انھوں نے جوش ملیانی کے بچپن اور ان کی ابتدائی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خصوصیات شعری پر بھی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس مجموعہ میں ایک نئی بات یہ پائی جاتی ہے کہ جوش نے سب سے پہلے ایک فہرست متروکات دیدی ہے جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے بڑے محتاط شاعر ہیں۔ آپ جوش ملسیانی اس دور کے شاعر ہیں، جب شعر پر فن کا زیادہ اثر تھا اور شاعری کا کم، لیکن باوجود اس کے ہمیں ان کے یہاں صحیح شاعری کے نمونے بھی بکثرت نظر آتے ہیں۔

ہندوستان و پاکستان کے درمیان آمد و رفت کا قانون

یونیتو ہر قانون اپنی جگہ اُلجھا ہوا ہوتا ہے اور اس سے ہر شخص فایدہ نہیں اُٹھا سکتا، لیکن ہندوستان و پاکستان کے درمیان آمد و رفت کی بابت جو قانون وضع ہوا ہے، وہ اور زیادہ اُلجھا ہوا ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ اس قانون کی پیچیدگیوں کو سمجھانے کے لئے اس کی شرح لکھی جائے اور نقشے وغیرہ دے کر ہر شخص کے لئے اسے قابل فہم بنایا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ لکھنؤ کے ایک مشہور و کامیاب ایڈوکیٹ سید کلب مصطفےٰ صاحب نے یہ شرح مرتب کر کے اس ضرورت کو پورا کیا۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ پاکستان و ہندوستان کے درمیان آمد و رفت کے کیا قواعد ہیں اور کس طریق سے پرمٹ وغیرہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں لکھی گئی ہے اور Peoples' Law Booksellers سعادت گنج لکھنؤ سے پانچ روپیہ میں مل سکتی ہے۔

سازِ الم

مجموعہ ہے جناب مانوس سہسرامی کی غزلوں کا۔ ابتدا میں جناب عبدالمالک آروی کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے مانوس اور مانوس کی شاعری سے بحث کی ہے۔ مانوس اسی دور کے شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری میں اُس دور کی روح پائی جاتی ہے جب شاعری اور درد و غم دونوں ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ قیمت ۱؎ ۔ ملنے کا پتہ :۔ الطاف حسین مانوس۔ محلہ املی آدم خاں۔ سہسرام (شاہ آباد)

رسالہ رفیق صحت

یہ ماہوار رسالہ ہے جو حکیم اقبال حسن صاحب لاہوری کی ادارت میں کئی ماہ سے شایع ہو رہا ہے۔ اس وقت ملک میں کئی طبی رسالے شایع ہو رہے ہیں لیکن شاید کم کسی اور رسالہ نے اس بات کا التزام کیا ہو کہ وہ وقتاً فوقتاً مخصوص امراض کی تشخیص و علاج کے لئے خصوصی نمبر شایع کرتا رہے۔ اسوقت تک تپ دق، بایو یریا اور اسی طرح کے دیگر امراض کے متعلق اس کے متعدد خاص نمبر شایع ہو چکے ہیں جو بہت مفید ہیں۔

حکیم اقبال حسن صاحب ایک کہنہ مشق طبیب ہیں اور بہت سے نوادر جو سینہ بہ سینہ انکے خاندان میں منتقل چلے آرہے ہیں، انھیں وہ نہایت صفائی کے ساتھ پیش کرتے رہتے ہیں۔ وہ حضرات جو اس فن سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ازبس مفید ثابت ہوگا۔ سالانہ چندہ تین روپیہ۔ پتہ :۔ رسالہ رفیق صحت لاہور۔

وادیٔ نیل

(پروفیسر شور)

ملکۂ مصر:۔ وہ عروسِ مصر وہ قتّارۂ وادیٔ نیل
نیل کے شفاف ساحل پر ملائک کا جمور
وہ بلوریں بازوؤں پر عنبریں زلفوں کا جال
"وہ سیہ زلفوں کا سایہ، وہ دہکتی آگ گال
زلف کا سایہ جبیں کی صبح پر تلتا ہوا،
وہ نفس اندر نفس موجِ گل و مشکِ تتار
رشتۂ الماس و گوہر بندِ محرم پر نثار
وہ بھرے بازو، وہ تنگی قبائے زر نگار
شمع جس کے قصر کی الماس سے جلتی رہی
چومتی ہو جس کے گیسو مشک و عنبر کی بہار
دیکھ اُس چشم سیہ سے ٹوٹتے تارے بھی دیکھ!!
جو گھٹا میں ڈوب جائے ہائے وہ بدرِ منیر
مرگِ سلطانی و میری، حور کا اشکِ حسیں

شاہ فاروق:۔ غیرتِ مریخ ہو جس کے ستاروں کا جلال
الاماں تیرا غضب ہے انقلابِ روزگار
تیغ لیتی ہے تری جب قصر و ایواں سے خراج
طمطراقِ میری و شاہی سے کب ڈرتا ہے تو
زمرے سلطانیٔ جمہور کے گاتا ہوا۔
ساز پر جمہور کے جب رقص فرماتا ہے تو
اے خداوندانِ استبداد حاضر ہو شیار
آنسوؤں سے دیدۂ جمہور جب ہوتا ہے نم
آندھیاں اُٹھتی ہیں اکثر بنّت و تاتار سے
زندہ بادے انقلاب لے۔ جلۂ ساحل شکار

دختہ پر جس کے بام حسن پر ہیں چہرئیل
مصر کے اہرام میں ناہید کا گایا سرود
جیسے روما کے کسی نقاش کا اُڑتا خیال
جیسے یوناں کے کسی ہیکل کی دیوی کا جلال
مرمریں سینہ شفق کی موج میں دُھلتا ہوا
وہ نظر اندر نظر رقصِ رگِ جانِ بہار،
آتشیں سینے سے لو دیتا ہوا موتی کا ہار
جیسے اُٹھنا درد، جیسے بند کلیوں کا فشار
رات جس کی اپنے چہرے پر سحر ملتی رہی
سر جھکا رے جس کے قدموں پر غرورِ شہریار
قصرِ شاہی میں صفِ ماتم کے نظارے بھی دیکھا
آہ وہ آہو، جو کھا جائے حرم میں آکے تیر!
کونسا ہے رنگ جو تصویرِ دوراں میں نہیں!
دیکھ لے چشمِ تماشا اُس کی شاہی کا مآل!
تیرے اک جھونکے سے بجھ جاتی ہے شمع شہریار!
لوٹتے ہیں تیری ٹھوکر میں شہنشاہوں کے تاج
زار و سنجر کے ہوسے کاٹیاں کرتا ہے تو
مسندوں کو روندتا، تاجوں کو ٹھکراتا ہوا،
ہڈیاں داراب و کسریٰ کی چبا جاتا ہے تو،
اُٹھ رہا ہے ایشیا کی خاک سے خونیں غبار!!
خون سے دُھلتا ہے اکثر پرچمِ مصر و عجم،
سیل ٹکراتے ہیں اکثر چین کی دیوار سے،
اے شہیدوں کے لہولے زندہ لاشوں کی پکار

زندہ بادے ابرِ نیساں لے بہاروں کے رسول
اور لہلہ تھوڑی سی شبنم اور کچھ تھوڑے سے پھول!!

شہزادۂ ظلمت

(فضا ابن فیضی اعظمی)

خلد و آدم کا نگہدار وہ جبریل کا دوست
فدسئ برزخ و لاہوت وہ ابلیسِ لعیں جس کا ہمعصر کوئی آج زمانے میں نہیں
جنّت آشوب وہ یزداں کی سیاست کا رقیب اادرہ کار وہ فطرت میں ہے مافوق و عجیب
ناری الاصل، کواکب صفت و مہر سواد شبنم آئین و صبا شیوۂ و تسنیم نہاد
کافر نور وہ شہزادۂ ظلمات و ظلوم
جس کے ادراک کی محراب ہے "مسجودِ علوم"

جس کے خرمن میں رہی آتشِ پندارِ نیاز وہ سراپا خلش و درد و غم و سوز و گداز،
جس کی خاموش نظر "شوخیِ بیدار" کا ظرف صفحۂ دانش و بینش کا چمکتا ہوا حرف
جس کے کردار سے روشن ہیں مذاہب کے چراغ جس کے افکار سے تازہ ہے فرشتوں کا دماغ
جس پہ آئینہ ہیں جبریل و سرافیل کے راز جس کے دامن پہ پڑھی سارے فرشتوں نے نماز
جس کی پیشانی پہ تسنیم کی موجوں کا غرور جس کے "انکار" میں جھلکا ترے "اقرار" کا نور
جس کی جرأت نے نہ دی سجدۂ آدم کو زکات متزلزل نہ ہوا جس کی نیایش کا ثبات
جس کے انفاس نے کھینچی رگِ طوبیٰ سے شراب جس کی آنکھوں نے مکمل کیا فردوس کا خواب
چشمِ یزداں میں رہا جس کی پرستش کا خمار موجِ تسنیم کا جنّت میں وہ زرخیز نکھار
جس کی آغوشِ جبیں مہدِ صد انوارِ سجود، جس کے سینے کی کھٹک ہم ردشِ بانگِ درود
جسم پر جس کے قیا حور و ملائک کی بھی تنگ کھا سکا تیغِ "عزائم" کو نہ انجام کا زنگ

جس کو گھایل نہ کبھی کر سکا یزداں کا سلوک
جس کو بیتاب کبھی کر نہ سکی خلد کی بھوک

جو کبھی ہو نہ سکا کارِ مشیت سے ملول
جس کے آئینے پہ بیٹھی نہ کبھی وقت کی دھول

جس کا اک ایک قدم مرحلۂ ذات و صفات
جس کی اک ایک نظر نشترِ تنقیدِ حیات

جس کی سطوت نے لیا عرصۂ عالم سے خراج
جس نے تبدیل کیا آدم و حوّا کا سماج

جس سے مجروح ہوا حضرتِ آدم کا شکیب
جس نے حوّا کو دیا خلد میں گندم کا فریب

جس کا تقویٰ نہیں وستار و عبا کا پابند
دب کے خود ٹوٹ گئی ریش و عمامہ کی کمند

جس کی تعلیم بنی، لذتِ عصیاں کی اساس
جس کے ویرانے پہ اکثر ہوا جنّت کا قیاس

مثلِ سایہ ہے خنک جس کی چمکتی ہوئی دھوپ
جس کے شعلوں میں نظر آتا ہے فردوس کا روپ

جس نے طیار کیا شعلوں سے اپنا ملبوس
گرمیٔ عشق کی لذّت سے رہا جو مانوس

جس نے تعمیر کیا اپنا الگ ایک حرم
جس نے توڑے ترے فردوس و فرشتہ کے صنم

جس کے سجدے نے کیا لوح و قلم پر صیقل
جس کے اشکوں سے جلا زمزم و کوثر کا کنول

جس نے توحید کا مفہوم جدا پیش کیا
اپنی بے لوث محبّت کو خوش اندیش کیا

جس کی تدبیر سے تقدیر بھی ہوتی ہے خجل
ارم و عرش کے سینے کا دھڑکتا ہوا دل

لامکاں گیر رہا جس کے تدبر کا خروش
قدس زاروں میں رہی جس کی نظر نکتہ فروش

جس نے حوروں میں پڑھی قرأتِ الہام و اذاں
جس نے آدم کو سکھائی روشِ سود و زیاں

جس کے ابرو کی کماں ہے خمِ محرابِ الست
جس کے پندار نے انسان سے کھائی نہ شکست

جس کو خوش آئی نہ جنّت کی غلامی ہرگز
بن سکی جس کی سیاست نہ مقامی ہرگز

جس نے مسمار کئے نسل و وطن کے اہرام
نہ بکی جس کی خودی طوبیٰ و تسنیم کے دام

وہ شبستانِ جنوں، بتکدۂ جرم و عذاب
جس کا آذر کدہ اک انجمن عقل و کتاب

جو کبھی لطف خداوند کا سایل نہ ہوا
جس پہ آسیبِ کرم نے کبھی سایہ نہ کیا

عقل سے کام لے، پھر عقدۂ ابلیس کو کھول!
چہرۂ برق پہ شبنم کی نگاہیں نہ ٹٹول!

جز خدائے دو جہاں او ہمہ است و ہمہ اوست

تصویر و تصوّر

(سیدہ اختر)

منظر ہے وہی جو پہلے تھا۔ تنویر بدلتی رہتی ہے!
تصویر کا آئینہ ہے وہی۔ تصویر بدلتی رہتی ہے!

"زندانِ بلا" کی قسمت پر واللہ بجا ہے ناز ہمیں!
ہم شعلہ ادا دیوانوں کی زنجیر بدلتی رہتی ہے!

"معمارِ جہاں" کے نعروں میں تاثیر کہاں، تعمیر کہاں؟
تخریب کے پہلو لے لے کر تعمیر بدلتی رہتی ہے!

پہلے تھی جہاں پر یہ دُنیا۔ شاید ہے وہیں پر یہ دُنیا!
اربابِ سیاست کی لیکن تدبیر بدلتی رہتی ہے!

بس اُنکا تلوّن ہوتا ہے، بس اُنکے اشارے ہوتے ہیں
ہم عشق و وفا کے ماروں کی تقدیر بدلتی رہتی ہے!

منزل ہے وہی دیوانوں کی، عالم ہے وہی رسوائی کا
ہاں صرف ہے اتنا رسم و رہِ تشہیر بدلتی رہتی ہے!

اظہارِ صداقت پر جتنی مجرم کو سزائیں ملتی ہیں
اُتنی ہی نرالی شان سے کچھ تقصیر بدلتی رہتی ہے!

کہدو کہ نہ بیٹھے شاد کوئی۔ ایوان یہ گرنے والے ہیں
تغیرِ جہاں کی فطرت ہے تعمیر بدلتی رہتی ہے!

اختر کی نوائے غم ہے وہی اور آج کی یہ دُنیا بھی وہی!
لیکن یہ کمالِ ندرت ہے، تاثیر بدلتی رہتی ہے!

(ندیم جعفری)

ہے ربطِ لطیف اب بھی تری یاد سے پیدا
احساس میں اک لذتِ بے نام وہی ہے

ہر چند نہیں آپ سے وہ نامہ و پیغام
دل میں خلشِ نامہ و پیغام وہی ہے

ہم تیری محبت میں ہیں بدنام ابھی تک
سرگرمِ کرم سرزنشِ عام وہی ہے

کبھی یقیں کے کرشمے کبھی گماں کے فریب
عجیب رنگ سے کھائے ترے جہاں کے فریب

یہی کہ رشتۂ رسمِ حجاب ٹوٹ گیا
مگر نہ کھل سکے اُس حُسنِ دلستاں کے فریب

بھٹک رہے ہیں ابھی تک تلاشِ منزل میں
دلیلِ رہ ہیں وہی میرِ کارواں کے فریب

پہونچ گئی ہے ہر اک بات اُس ستمگر تک
ہر ایک بات میں کھائے ہیں رازداں کے فریب

مطبوعات موصولہ

میدان عمل منشی پریم چند کا مشہور ناول جسے مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ دہلی نے پانچویں بار نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔ ضخامت ۵۲۶ صفحات، قیمت چھ روپیہ۔

منشی پریم چند پہلے شخص تھے جنھوں نے اُردو فسانہ نگاری اور ناول نگاری میں مجتہدانہ قدم اُٹھایا اور مقامی رنگ مقامی ضرورتیں، سماجی اقتضاء اور مسایل معاشرت شامل کرکے اس کا مرتبہ بلند کیا۔ ہر چند اس قسم کے ناول لکھنے کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد سے ہوئی تھی، لیکن ڈپٹی صاحب نے جو کچھ لکھا وہ ایک مخصوص طبقہ، ایک مخصوص نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر لکھا اور اس لئے ان کے یہاں کوئی عمومی اپیل اصلاح کی نہیں پائی جاتی۔ علاوہ اس کے فنی حیثیت سے بھی انکی کتابیں معیاری درجہ نہ رکھتی تھیں، منشی پریم چند نے اپنا فن مغرب سے حاصل کیا اور مغربی اصول ہی کو سامنے رکھ کر فسانے اور ناول لکھنا شروع کئے، جن میں ادبی لطافت، تجزیۂ کردار اور اصلاح معاشرت وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ پریم چند کی کامیابی کا راز ان کا نفسیاتی مطالعہ تھا جو ان کے افسانوں اور ناولوں کے پلاٹ اور ٹکنک میں ہر جگہ ان کا ساتھ دیتا تھا اور مقصود وغایت تک نہایت دلنشین طور پر پہونچا دیتا تھا۔

اس ناول میں پریم چند کی تمام خصوصیات فسانہ نگاری بہت نمایاں نظر آتی ہیں اور اپنے قصہ کو انھوں نے اس قدر دلچسپی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے کہ پڑھنے والا غیر محسوس طور پر ان کے ساتھ ساتھ چلنے اور اخیر میں ایک منطقی نتیجہ تک پہونچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ یہ ناول حد درجہ دلچسپ ہے اور ضرورت ہے کہ گھریلو زندگی کو سنوارنے کے لئے ہر مرد عورت اسکا مطالعہ کرے۔

تنقید کیا ہے پروفیسر سرور کے آٹھ انتقادی مقالات کا مجموعہ جسے مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ دہلی نے نہایت پسندیدہ طباعت و کتابت کے ساتھ سفید چکنے کاغذ پر مجلد شایع کیا ہے، ضخامت ۱۱۴ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔ پروفیسر سرور اس عہد کے بہترین نقادوں میں سے ہیں اور ان کے انتقادی مقالات کے کئی مجموعے اس سے قبل شایع ہوچکے ہیں۔ سرور کی نقادانہ عظمت ان کی اعتدال پسندی میں پنہاں ہے۔ ان کے کسی مقالہ سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے کسی خاص مصنف کے متعلق پہلے سے کوئی خاص رائے قایم کرلی ہے اور اسی رائے کو سامنے رکھ کر وہ اس کی تصنیف پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ یہ ضبط اور ٹھہراؤ نقاد کی بڑی صفت ہے اور جب تک یہ صفت اس میں نہ پائی جائے ہم صحیح رہبری کی توقع اسکی طرف سے کبھی نہیں کرسکتے۔

سرور کے انداز بیان میں ہمیں کہیں تلخی و خشونت نظر نہیں آتی حتےٰ کہ ان کی حرف گیری میں بھی "بوئے خوشدلی" پائی جاتی ہے۔ اسی لئے بعض حضرات کا خیال ہے کہ سرور کی تنقیدوں میں قطعیت و اذعانیت کی کمی ہے۔

سرور، یک رُخے نقاد نہیں ہیں، اور ان کے انتقاد میں ہم کو فنی و جذباتی، دونوں طرح کی پختگی پائی جاتی ہے۔ وہ باوجود ترقی پسند ادیب ہونے کے پوری طرح محسوس کرتے ہیں کہ ترقی پسندی کے سیلاب میں کتنے خس و خاشاک سامنے آگئے ہیں اور وہ کبھی اس رجعت پسندانہ خیال کی حمایت نہیں کرتے کہ "کلاسکل ادب یکسر رجعت پسندانہ چیز ہے"۔

ان کی کامیابی کا دوسرا راز ان کے انداز بیان کی شگفتگی ہے، وہ جیسا صاف سوچتے ہیں ویسا ہی صاف کہنا بھی چاہتے

ہیں اور کہہ دیتے ہیں، ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور حافظہ قوی اس لئے وہ بیک وقت بہت سی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جنکی اگر تفصیل چاہی جائے تو ان میں سے ہر ایک بات بجائے خود ایک مستقل موضوع بحث بن سکتی ہے۔ کاشکے سرور کے یہاں ہلکا سا مزاح بھی پایا جاتا جو انتقاد کی جان ہے۔

اس مجموعہ میں ان کے آٹھ مقالات شامل ہیں:- یادگارِ حالی - اکبر کی ظرافت - شبلی - اقبال کے خطوط - موجودہ ادبی مسایل ولیم سمرسٹ مائم - ترقی پسند تحریک - تنقید کیا ہے - اور ان میں سے ہر مقالہ اپنی جگہ بڑے کام کی چیز ہے۔ خصوصیت کے ساتھ آخری مقالہ اس لئے زیادہ اہم ہے کہ اس سے خود سرور کے نظریۂ انتقاد پر روشنی پڑتی ہے اور اس کو سامنے رکھ کر ہم ان کے انتقادی مقالات پر تنقید کر سکتے ہیں۔

کشمیر پر حملہ شری متی کرشنا مہتا کی تصنیف ہے جسے مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ دہلی نے کافی اہتمام کے ساتھ شایع کیا ہے۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات - قیمت دو روپیہ۔

تقسیم ہند کے بعد جب قبایلیوں کا حملہ کشمیر پر ہوا ہے اس وقت شری دنی چند مہتا (مصنفہ کے شوہر) حکومت کشمیر کی طرف سے مظفر آباد میں وزیر کی حیثیت سے مامور تھے اور شری متی کرشنا مہتا بھی ان کے ساتھ تھیں اس لئے ظاہر ہے کہ انسے زیادہ سچا راوی اس حملہ کا اور کون ہو سکتا ہے۔

مصنفہ نے اس کتاب میں ابتداء سے آخر تک اس حملہ کے تمام وہ واقعات و حالات قلمبند کئے ہیں جو ان کی نگاہوں سے گزرے اور جن سے وہ خود براہ راست متاثر ہوئیں۔ اس حملہ میں ان کے شوہر بھی قتل کئے گئے، ان کے بچوں پر بھی بڑی بڑی مصیبتیں نازل ہوئیں، لیکن انھوں نے ان تمام مصائب کا مقابلہ بڑی ہمت و استقلال کے ساتھ کیا اور کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی وہ صداقت و انصاف سے منحرف نہیں ہوئیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے ہم کو نہ صرف اس ہنگامہ کے صحیح حالات معلوم ہوتے ہیں، بلکہ اس کا حقیقی پس منظر بھی سامنے آجاتا ہے جو یقیناً بہت افسوسناک ہے۔ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ ایک بار ہاتھ میں لے لینے کے بعد کوئی شخص اسے چھوڑ نہیں سکتا اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مصنفہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ انتہائی سچائی کے ساتھ لکھا ہے۔

حبہ خاتون ڈرامہ ہے پروفیسر محمد مجیب کا لکھا ہوا جسے مکتبۂ لمیٹیڈ دہلی نے شایع کیا ہے۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت ۱۲ر عہد مغلیہ کے دور اکبری میں حبہ خاتون کشمیر کی ایک خاص شخصیت تھی جس نے باوجود ملکۂ کشمیر ہونے کے سب سے پہلے وہاں جمہوریت کی تبلیغ کی۔ یہ ایک معمولی کشمیری خاندان کی عورت تھی جو فرمانروائے کشمیر کے ازدواج میں آگئی۔ حبہ خاتون شاعرہ بھی تھی اور مغنیہ بھی، لیکن اس کے شعر و نغمہ میں آزادی کی روح پوری طرح دوڑ رہی تھی جس نے اس کے وطن کی فضا اور حکومت کو بڑی حد تک متاثر کیا — پروفیسر محمد مجیب حبہ خاتون کے سوانح حیات کو سامنے رکھ کر یہ ڈرامہ مرتب کیا ہے اور فنی خصوصیات و محاسن کے لحاظ سے بڑی مکمل چیز ہے۔

محاسن کلام غالب مشہور تصنیف ہے ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری مرحوم کی جسے انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ نے شایع کیا ہے۔ ضخامت ۲۷۰ صفحات - قیمت عہ۔

ڈاکٹر بجنوری پہلے شخص ہیں جنھوں نے یہ لکھ کر کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوان غالب" "پرستاران غالب" کی جماعت پیدا کی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غالب کی طرف ہمارے ادیبوں کی توجہ زیادہ تر بجنوری مرحوم ہی کی وجہ سے ہوئی۔

جس وقت مرحوم بھوپال میں تھے، ان کو غالب کے دیوان کا ایک مطبوعہ نسخہ وہاں کے کتب خانہ میں نظر آیا۔ اس میں

غالب کا تمام اُردو کلام بغیر کسی حذف و اضافہ کے شامل تھا اور جسے "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے انھوں نے شایع کیا ہے۔
یہ مقالہ اس نسخۂ حمیدیہ کا مقدمہ ہے جو "محاسن کلام غالب" کے عنوان سے انھوں نے لکھا تھا۔ اس مقالہ میں مرحوم نے پورے جوش عقیدت کے ساتھ غالب کی خصوصیات شعری کو پیش کیا ہے اور اس کے بہت سے ایسے اشعار کی وضاحت کی ہے جو واقعی شرح و تفسیر کے محتاج تھے۔

اس مقدمہ کے مطالعہ سے نہ صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ غالب کے کلام کو عام متداول پہلوؤں سے ہٹ کر اور کن کن جدید زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے بلکہ یہ بھی کہ خود مرحوم کی نظر انتقاد کتنی گہری تھی۔

ہر چند مرحوم کے بیان میں کہیں کہیں حد سے زیادہ بڑھا ہوا جوشِ عقیدت پایا جاتا ہے، لیکن اس کی اساسی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

اول اول یہ مضمون رسالۂ اُردو میں شایع ہوا تھا۔ اس کے بعد کتابی شکل میں کئی بار شایع ہوا اور اب یہ بالکل نایاب تھا۔ اس لئے انجمن ترقی اُردو نے اس کو پھر شایع کرکے یقیناً ادب اُردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور نہ صرف عقیدتمندان غالب بلکہ انتقادی ذوق رکھنے والوں کے لئے بھی اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

یادگار حالی حالی کے سوانح حیات ہیں، مرتبہ صالحہ عابد حسین جسے انجمن ترقی اُردو ہند علی گڈھ نے نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع کیا ہے۔ ضخامت ۲۴۲ صفحات قیمت للعہ

حالی کا مرتبہ نقاد اور سوانح نگار کی حیثیت سے بہت بلند ہے اور ضرورت تھی کہ یادگار غالب کے مصنف کی یاد میں یادگار حالی بھی لکھی جائے۔ لیکن اسے کون لکھے یہ بڑا سوال تھا۔ اگر آج وحیدالدین سلیم زندہ ہوتے تو یہ خدمت انھیں کے سپرد کی جاتی، لیکن شکر ہے کہ صالحہ عابد حسین نے اس بارگراں کو اپنے سر لے لیا اور اس حیثیت سے کہ وہ حالی کی نواسی ہیں ان سے زیادہ مستحق اور معتبر کوئی اور ہو بھی نہ سکتا تھا۔ اس کتاب میں حالی کے بچپن، ان کی تعلیم، ان کے عادات و خصایل وغیرہ کے علاوہ ان کے مشہور تصانیف پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے اور اس طرح یہ کتاب "تذکرہ و انتقاد" دونوں کا نہایت لطیف امتزاج ہے جس سے نہ صرف حالی کی شخصیت بلکہ انکی ادبی و علمی کارناموں پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ انجمن ترقی اُردو نے اس کتاب کو شایع کرکے اُردو ادب کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔

ایک مشرقی کتب خانہ از سید مبارزالدین رفعت ام۔ اے معلم ادبیات فارسی جامعۂ عثمانیہ۔ پبلشر۔ انجمن ترقی اُردو ہند علیگڈھ۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات قیمت تین روپیہ۔

عرصہ ہوا ایک مستشرق دی۔ سی۔ اسکاٹ او کونر نے کتب خانہ خدا بخش بانکی پور کا مفصل حال لکھا تھا۔ اسی کو رفعت صاحب نے اُردو میں منتقل کردیا ہے۔ اس کتاب میں پہلے نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ مولوی خدا بخش نے کس طرح اس کتب خانہ کی بنیاد ڈالی اور کس کس طرح نادر کتابیں انھوں نے حاصل کیں۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے یہاں کی نادر مخطوطات کا ذکر بھی نہایت دلچسپ انداز میں کیا ہے، اس کے بعد فارسی عربی کے ان نادر مخطوطات کی فہرست بھی دیدی ہے جو تقریباً نایاب ہیں۔
انجمن ترقی اُردو نے اس کتاب کی اشاعت سے ریسرچ کرنے والے طلبہ کے لئے بڑی آسانیاں پیدا کردی ہیں۔

جنون و ہوش مجموعہ ہے جوش ملسیانی کی غزلوں اور نظموں کا جسے منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز دہلی نے مجلد شایع کیا ہے۔ ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت چار روپیہ۔ جناب جوش ملسیانی کا تعلق سرزمین پنجاب سے ہے اور وہیں کی فضا میں انکی شاعری کی ابتدا ہوئی تھی۔ آپ کا شمار داغ کے اچھے تلامذہ میں سے ہے، اور غول کی طرح آپ نظم بھی خوب کہتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۹۴ پر ملاحظہ فرمایئے)

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر [redacted] ہوئی ہے، قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان تخیل، اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشاء حالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح [redacted] ایش خط ہے

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:۔

(۱) چند گمنام فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

(۲) مانیئن کا مذہب نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے

قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فراست المید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ارباب طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے یہی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اردو غزل گوئی کی مہد یہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد فنون اور پیرہ حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

Acc. 1. No A 466

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری - مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجد دلین نمبر" ہے جس میں ایک ہمیشل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی - قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً ۳۰ افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کو نگاری کے سیکھنے والے کے لئے اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ... اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "مادس ہنڈس" کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں یورپی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیات عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اس کو ایکبار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے"

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

سالنامہ سنہ ۱۹۵۲ء

حسرت نمبر جس میں ملک کے تمام اکابر قدر ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول